ماہنامہ

قومی زبان

حیدرآباد

تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، ثقافتی، فنی و سائنسی جریدہ

نومبر 2018ء

-/15 روپے

ISSN 2321-4627

عظیم مجاہد آزادی، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد

قرینہ

ہم کلامی

	:	پروفیسر ایس اے شکور	6

مضامین :

مولانا ابوالکلام کی تاریخی بصیرت	:	ڈاکٹر عقیل ہاشمی	7
مولانا آزاد کا جامع مسجد دہلی میں خطاب اوراس کی عصری معنویت	:	ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی	13
مولانا آزاد کا اسلوبِ طنز طنزیاتِ آزاد کے حوالے سے	:	ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری	18
مولانا ابوالکلام آزاد فن خطوط کے آئینہ میں	:	ڈاکٹر ضامن علی حسرت	24
''یوسف علیہ السلام'' مولانا آزاد کی فراموش کردہ کتاب	:	ظہیر دانش عمری	29
مولانا آزاد کی فکر وسیاسی بصیرت	:	ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی	33
مولانا ابوالکلام آزاد اور علوم جدیدہ	:	ڈاکٹر ابرار احمد اجراوی	37
''خطباتِ آزاد'' میں خواتین کا تذکرہ	:	ڈاکٹر جان نثار معین	42
''مولانا ابوالکلام آزاد ملت اسلامیہ کی ایک عظیم المرتبت شخصیت	:	حلیم بابر	52
مولانا آزاد کی تقاریر میں مساوات و یکجہتی کا درس	:	محمد ارشد مبین زبیری	55
''مولانا ابوالکلام آزاد'' ایک ہمہ جہت شخصیت	:	خیر النساء علیم	59
مسلمانوں میں سیاسی شعور: الہلال کا کردار	:	انور ہادی	64
تحریکِ آزادی کے دو جانباز سپاہی۔ آزاد و جوہر	:	ڈاکٹر شیخ فاروق باشاہ	68
مولانا آزاد کی تعلیمی فکر اور اس کی افادیت	:	محسن خان	74
مولانا آزاد کی تین اہم تصانیف	:	ناز آفرین	78

oOo

لکچرر، گورنمنٹ ڈگری کالج
رائے چوٹی، ضلع کڈپہ (آندھرا پردیش)

ڈاکٹر شیخ فاروق باشاہ

تحریکِ آزادی کے دو جانباز سپاہی۔ آزاد و جوہر

ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلمانوں کا رول نہایت واضح اور دو ٹوک رہا ہے۔ مسلمان اپنے رہنماؤں کی رہبری میں ہندوستانی اقلیتی طبقے ہونے کے باوجود اکثریتی طبقہ سے کہیں بڑھ کر جان و مال کی قربانی پیش کی۔ مسلمانوں میں قومیت، وطنیت اور جذبہء حریت پیدا کرنے میں جن اہم قائدین کا رول رہا ہے ان میں سرفہرست امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور رئیس الاحرار مولانا محمد جوہر ہیں۔

خدا نے ان دونوں قائدین کو بے شمار صلاحیتوں اور لیاقتوں سے نوازا تھا۔ تقریر ہو یا تحریر، صحافت ہو یا سیاست، قیادت ہو یا امامت، نظم ہو یا نثر، ہر میدان کے وہ ماہر تھے، سب سے بڑھ کر دونوں جذبہء ایمانی سے سرشار تھے۔ کبھی انہوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے کسی سے سمجھوتہ نہ کیا۔ اور نہ دشمنوں کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے باعث وہ چاہتے تو انگریزی حکومت میں بڑے سے بڑا عہدہ پا سکتے تھے۔ اور ان کی زندگی شاہانہ گزر سکتی تھی لیکن انہوں نے فقیری اور اسیری کی زندگی کو محبوب جانا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں حالات شدید انتشار سے دو چار تھے۔ ہندوستانیوں کے لیے ہر قدم پر کانٹے بچھے ہوئے تھے۔ ان حالات میں صحافت کی پر خار وادی میں قدم رکھنا اپنے لیے موت کو دعوت دینا تھا۔ محمد علی جوہر آزاد سے دس سال بڑے تھے۔ چنانچہ ان کو صحافت کے میدان میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ وہ انگریزی زبان پر بے پناہ قدرت رکھتے تھے۔ چنانچہ قوم و ملک کی خدمت کے لیے انہوں نے کامریڈ کے نام سے ۱۴۔ جنوری ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ جسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہندوستانیوں کے دل جیت ہی لیے لیکن اہل زبان انگریز بھی مولانا کے اسلوب پر فریفتہ ہو گئے اور بے چینی سے اخبار کی راہ تکتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے ''الہلال'' اخبار جاری کیا۔ جس کے عزائم جتنے بلند تھے زبان و اسلوب بھی اتنا ہی دلکش اور پر تاثیر تھا۔ مولانا آزاد بھی صحافت کے ذریعے قوم ملت کی خدمت اور اہل ہند میں جذبۂ حریت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ الہلال میں لکھتے ہیں۔ ''ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاش زیاں و نقصان کے لیے آئے ہیں۔ صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلبگار ہیں، عیش کے پھول

نہیں بلکہ خلش واضطراب کے کانٹے ڈھونڈ تے ہیں۔''

(ایوان اردو، دہلی دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۴۸)

جس طرح مولانا محمد علی کی انگریزی نے ساری دنیا میں دھوم مچادی اسی طرح مولانا آزاد کی نثر نے حیات آفرین کا درجہ پایا۔ مولانا آزاد کی اردو نثر کے تقابل میں مولانا محمد علی تو کیا کوئی بھی اہل قلم دور دور تک ان کا ہم سایہ نظر نہیں آتا ہے۔

''الہلال اور ہمدرد'' نے اردو صحافت کو ایک نیا معیار عطا کیا۔ قوم دوستی، حب الوطنی، سیاسی بیداری کے جذبات پیدا کیے۔ باطل اوہام اور فرسودہ تصورات کا قلع قمع کیا۔ اہل ہند کے دلوں میں تحریک آزادی کی روح پھونک دی دونوں اخباروں نے کھل کر ہندو مسلم اتحاد اور یکجہتی کا سبق پڑھایا۔ محمد علی اپنے اخبار ہمدرد میں اتحاد کے تعلق سے مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ بیان جاری کیا۔

''اس وقت کی اہم ترین ضرورت اتحاد ہے' میں توقع کرتا ہوں کہ لیڈران چھوٹے چھوٹے اختلافات کو نظر انداز کر دیں گے۔ اور وقت کا جو کچھ تقاضہ ہے اس کو پورا کرنے کے لیے تیار ہوں گے''۔

(ہمدرد ۲۴۔ نومبر ۱۹۲۴ء ص ۵)

ہندوستان کی تحریک آزادی کو تقویت پہنچانے میں تحریک خلافت کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس تحریک کے تاسیس گزاروں میں مولانا محمود الحسن اور مولانا عبد الباری ہیں لیکن اس تحریک کو عام کرنے اور بلا تفریق مذہب وملت سارے ہندوستانیوں کو اس میں شمولیت کے لیے فضا تیار کرنے میں جہاں بہت سے علماء کا رول رہا ہے وہیں علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کاوشیں بھی ناقابل فراموش ہیں۔ خلافت تحریک کو اس وقت اور بھی استحکام ملا جب اس میں گاندھی جی بھی شریک ہوگئے۔ بالآخر یہی تحریک تحریک آزادی میں تبدیل ہوگئی۔ علی برادران اور تحریک خلافت ایک جاں دو قالب ہوگئے۔ یہ اشعار زبان زد خاص وعام تھے:

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ ہیں تیرے شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے
کرتی سب کو خلافت پہ صدقے

مولانا آزاد اور مولانا محمد علی کو صحافت اور خطابت کی بدولت کئی بار جیل جانا پڑا، قصور صرف یہ تھا کہ دونوں صحافت کے ذریعہ ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی کی روح پھونک رہے تھے اور مکمل آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مولانا آزاد اپنی زندگی کے ۹ رسال ۷ رمہینے زندان فرنگ میں رہے اور محمد علی تقریباً ۷ رسال قید فرنگ میں رہے۔ ان دونوں بزرگوں نے قید کی زندگی کو ہنسی خوشی قبول کرلیا۔

مولانا آزاد ایک خط میں لکھتے ہیں

''وقت کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے، اس پر نہیں کہ

نہیں بلکہ خلش واضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔''
(ایوان اردو، دہلی دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۴۸)

جس طرح مولانا محمد علی کی انگریزی نے ساری دنیا میں دھوم مچادی اسی طرح مولانا آزاد کی نثر نے حیات آفرین کا درجہ پایا۔ مولانا آزاد کی اردو نثر کے تقابل میں مولانا محمد علی تو کیا کوئی بھی اہل قلم دور دور تک ان کا ہم سایہ نظر نہیں آتا ہے۔

''الہلال اور ہمدرد'' نے اردو صحافت کو ایک نیا معیار عطا کیا۔ قوم دوستی، حب الوطنی، سیاسی بیداری کے جذبات پیدا کیے۔ باطل اوہام اور فرسودہ تصورات کا قلع قمع کیا۔ اہل ہند کے دلوں میں تحریک آزادی کی روح پھونک دی دونوں اخباروں نے کھل کر ہندو مسلم اتحاد اور یکجہتی کا سبق پڑھایا۔ محمد علی اپنے اخبار ہمدرد میں اتحاد کے تعلق سے مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ بیان جاری کیا۔

''اس وقت کی اہم ترین ضرورت اتحاد ہے' میں توقع کرتا ہوں کہ لیڈران چھوٹے چھوٹے اختلافات کو نظرانداز کردیں گے۔ اور وقت کا جو کچھ تقاضہ ہے اس کو پورا کرنے کے لیے تیار ہوں گے''۔

(ہمدرد ۲۴۔ نومبر ۱۹۲۴ء ص ۵)

ہندوستان کی تحریک آزادی کو تقویت پہنچانے میں تحریک خلافت کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس تحریک کے تاسیس گزاروں میں مولانا محمود الحسن اور مولانا عبدالباری ہیں لیکن اس تحریک کو عام کرنے اور بلاتفریق مذہب وملت سارے ہندوستانیوں کو اس میں شمولیت کے لیے فضا تیار کرنے میں جہاں بہت سے علماء کا رول رہا ہے وہیں علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کاوشیں بھی ناقابل فراموش ہیں۔ خلافت تحریک کو اس وقت اور بھی استحکام ملا جب اس میں گاندھی جی بھی شریک ہوگئے۔ بالآخر یہی تحریک تحریک آزادی میں تبدیل ہوگئی۔ علی برادران اور تحریک خلافت ایک جاں دو قالب ہوگئے۔ یہ اشعار زبان زد خاص وعام تھے:

بولیں اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ ہیں تیرے شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے
کرتی سب کو خلافت پہ صدقے

مولانا آزاد اور مولانا محمد علی کو صحافت اور خطابت کی بدولت کئی بار جیل جانا پڑا، قصور صرف یہ تھا کہ دونوں صحافت کے ذریعہ ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی کی روح پھونک رہے تھے اور مکمل آزادی کا مطالبہ کررہے تھے۔ مولانا آزاد اپنی زندگی کے ۹ رسال ۷ رمہینے زندان فرنگ میں رہے اور محمد علی تقریباً ۷ رسال قید فرنگ میں رہے۔ ان دونوں بزرگوں نے قید کی زندگی کو ہنسی خوشی قبول کرلیا۔

مولانا آزاد ایک خط میں لکھتے ہیں:
''وقت کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے، اس پر نہیں کہ

سات برس آٹھ مہینے قید و بند میں کیوں کٹے؟ اس پر کہ صرف سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں کٹے؟۔

(ایوان اردو دہلی، دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۴۲)

مولانا محمد علی اپنی اسیری کے ایام کو خوش قسمتی سے تعبیر کرتے ہیں:

فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ
بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

آزاد و جوہر خوددار طبیعت کے مالک تھے۔قوم کے مفاد کی خاطر انہوں نے اپنے ذاتی مفاد کو قربان کردیا۔دوران اسیری مولانا آزاد نے اپنی رفیق حیات کی شدید علالت ،رحلت اور آخری رسومات میں شرکت کے لیے درخواست دینے کوقوم کے مفاد کے مغائر اور اپنے لیے باعث ہزیمت سمجھا۔اپنی وفا شعار بیوی کی ہمیشہ کی جدائی کو گوارا کرلیا لیکن حکام وقت کے آگے جھکنا پسند نہیں کیا۔بالکل اسی طرح مولانا محمد علی بھی بیجاپور جیل میں محروس تھے، بیٹی آمنہ شدید ترین مرض دق میں مبتلا تھیں اور اسی مرض میں وہ بھی اس دنیا سے رحلت کر گئیں۔بیٹی کی وفات والد کے دل پر کیا قیامت ڈھائی ہو گی لیکن مولانا نے غم جدائی کو برداشت کرلیا۔صبر وشکر اور تسلیم ورضا کا پیکر بنے رہے۔اور کیا ہی خوب کہا:

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

مولانا آزاد اور مولانا محمد علی کے مابین کئی چیزوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔صحافت،سیاست اور خطابت کی صلاحیتیں دونوں کے رگ و پے میں سرایت کرگئی تھیں۔راسخ العقیدہ مذہبی پیروکار ہونے کے ساتھ حب الوطنی ،قوم دوستی اور ملت کی خیر خواہی کے جذبات سے سرشار تھے۔صاحب طرز ادیب، بلند پایہ نثر نگار اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ایک کو شاعری میں تفوق ہے تو دوسرے کونثر میں تقدم۔

مولانا آزاد اور جوہر کی نثر کا تقابل کیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی جوہر کے یہاں مولانا آزاد جیسا حُسن ، دلکش اسلوب اور زور بیان نہیں لیکن خلوص، درد، تاثیر، عام فہمی اور سلاست اور دل نشینی میں یقیناً ان کی نثر کسی طرح سے پیچھے نہیں ہے۔

سید حامد مولانا آزاد اور مولانا جوہر کی نثر کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابوالکلام کی بلند پروازی کے مقابلے میں جوہر کے یہاں پیادہ روی ہے۔ وہاں ادب عالیہ اوراختراعات فائقہ، یہاں صرف یہ جاں سوز فکر کہ ایک قوم کی قوم کو، ایک جاہل پس ماندہ قوم کو اپنا مفہوم کس طرح ذہن نشین کرایا جائے ،لیکن محمد علی کا انگریزی پر اہل زبان کا سا عبور وہ اضافی وصف ہے جو ابوالکلام کو میسر نہ تھا۔علاوہ بریں محمد علی کی نثر (اُردو) زبان اور محاورہ کی اُن غلطیوں سے محفوظ ہے جو رُخِ زیبا پر تل کی طرح ابوالکلام کے یہاں مل جاتی ہے''۔

(نظر برنی،مولانا محمد علی شخصیت اور خدمات نئی دہلی،ص ۱۹۲)

مولانا محمد علی جوہر اور مولانا آزاد جنگ آزادی میں دونوں ہم سفر تھے۔حصول آزادی میں دونوں کا ساتھ

تقریباً ۱۵ سال رہا۔ دونوں میں بہت ساری مماثلتیں اور مشابہتیں پائی جاتی ہے۔ دونوں بے باک اوراعلیٰ درجے کے صحافی تھے۔ دونوں شاعر اور نثر نگار۔ دونوں سچے اور پکے مسلمان اور مذہبی عبادات کے پابند تھے۔ ۱۵ سال کے عرصہ میں صحافت، سیاست اور ملکی و مسلکی مسائل کے تئیں دونوں کے درمیان رفاقت اور رقابت رہی۔ پھر بھی دونوں ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے اور اختلافات رائے کا اظہار بھی برملا کرتے تھے۔ مولانا آزاد کا اسلوب اشارے اور کنایے کی زبان میں ہوتا، لیکن مولانا محمد علی کا اظہار برملا جوشیلے انداز میں ہوتا، اور انداز تخاطب بالکل راست ہوتا۔ دونوں میں رقابت کی وجہ ذاتی رائے نہیں بلکہ قوم وملت کی فلاح و بہبودی تھی۔ مولانا محمد علی اور مولانا آزاد بعض مسائل میں ایک دوسرے سے متفق نہیں تھے۔ مولانا آزاد نے اپنے اخبار ''الہلال'' میں مولانا محمد علی کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''مسٹر محمد علی سے ہمارے تعلقات اب صرف دوستانہ ہی نہیں، ایسے قریب کہ عزیزانہ ہیں کہ ان کی نسبت رائے قائم کرنے کا پورا موقع رکھتے ہیں۔ ہم نے اچھی طرح اندازہ کرلیا کہ ان کے دل میں آزادی اور جوش، دونوں چیزیں موجود ہیں''۔

(ضیاءالحسن فاروقی ماہنامہ جامعہ اپریل ۱۹۷۹ء ص ۱۰۲)

مولانا محمد علی کی انگریزی انشا پردازی اور قوت تحریر کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں:

''یہی مسٹر محمد علی ہیں جو اِن تمام تعلیمات و ہدایات عالیہ کے مرکز جمود (علی گڑھ کالج) کے تعلیم یافتہ اور ایک ایسی ریاست کے عہدہ دار تھے۔ چند مضامین اور ایک رسالہ لکھ کر اُنہوں نے اپنی قابلیت ضرور منوائی تھی۔ لیکن کوئی بھی ان کی موجودہ حیثیت ملی سے واقف نہ تھا لیکن جب زمانے نے مہلت دی اور قوتوں کو چمکنے کے اسباب میسر آئے تو آج کوئی نہیں جو ان کی انگریزی انشا پردازی اور قوت تحریر و بحث کا معترف نہ ہو''۔

(ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جوہر نمبر ۱۹۸۶ء ص ۱۰۲)

مولانا محمد علی جوہر گرچہ کہ عمر میں مولانا آزاد سے بڑے تھے پھر بھی وہ انہیں اپنا استاد مانتے تھے، لیکن جب ان دو عظیم شخصیتوں کے درمیان اختلاف ہوا تو ہر ایک نے کھل کر اس کا اظہار کیا۔ لیکن وہی شائستہ اور سلجھے ہوئے انداز میں، کہیں اُنھوں نے ذاتیات کو موضوع بحث بننے نہیں دیا۔ دونوں کی تحریریں پُر وقار، سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ساتھ ادبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

مولانا آزاد کا الہلال جب منظر عام پر آیا تو مسلم یونیورسٹی کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ اول روز ہی سے اس تحریک سے متعلق لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یکم ستمبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں مولانا آزاد نے ''مسلم یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر مولانا محمد علی سے چند اُمور کی وضاحت چاہی تھی۔ الہلال کی اس اشاعت میں مولانا آزاد کے اس مضمون کی دوسری اور آخری قسط بھی چھپی تھی جس کا عنوان تھا

''نشۂ شام کی نصف شب''۔

مولانا آزاد ''مسلم یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''ہم کو معلوم ہے کہ ہمارے دوست وہی محمد علی ہیں جنھوں نے نواب محسن الملک مرحوم کے زمانے میں اپنے کالج سے نئے نئے خطابات حاصل کئے تھے اور پھر یہ وہی محمد علی ہیں جنھوں نے ہمیشہ کالج کی زر پرستی کی مخالفت کی اور ٹرسٹیوں کی دائمی حکمرانی کے مسئلے کو بار بار چھیڑا۔ وہ گو ہمیشہ علی گڑھ میں رہے مگر ہم نے تو ہمیشہ ان کو اس کے باہر ہی دیکھا ہے اور اب تو میلوں دور دیکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے جب چاہا تھا کہ آذر کے بتکدے کو توڑے تو خود اسی کے گھر میں خلیل بت شکن کو پیدا کر دیا تھا۔ ہم کو یقین ہے کہ مسٹر محمد علی بھی علی گڑھ سے اس لئے اُٹھائے گئے ہیں تاکہ اپنے گھر کی دیواروں سے بت پرستی کے نقوش مٹا دیں......

یونیورسٹی کمیٹی کے متعلق عام طور پر موجودہ حالات نے بے اعتمادی اور شکوک پیدا کر دیئے ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر وہ حق گوئی اور بے لاگ سچائی کی قدر و قیمت کو پیش نظر رکھ کے مندرجہ ذیل اُمور پر اپنی معلومات ظاہر کر دیں۔ وہ ابتداء سے شریکِ کار رہے ہیں اور ہم کو شکوک اور سوءِ ظن سے نجات دے سکتے ہیں''۔

(ضیاء الحسن فاروقی ماہنامہ جامعہ اپریل ۱۹۷۹ء ص ۱۰۳)

مولانا محمد علی کب خاموش رہنے والے تھے۔

الہلال کے دونوں مضامین کا جواب دیتے ہوئے اپنا ایک مکتوب شائع کرایا جس کے چند ٹکڑے درج ذیل ہیں:

''مانا کہ الہلال افقِ عالم پر اس وقت نمودار نہ ہوا تھا مگر آزادی کے بدر کامل کو یہ کیسا گہن لگا تھا کہ آج کامل ایک سال بعد ظلمتِ علی گڑھ پر نور ایمان غالب آیا ہے''۔

''آنجناب نے صرف سرہار کورٹ بٹلر کی ۹ / اگست ۱۹۱۲ء کی تحریر کا ترجمہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں پڑھا اور اس میں جو فقرہ ۳۱ / جولائی ۱۹۱۱ء سے ماخوذ تھا اس کی غلط تاویل فرما کر بلا غور و فکر اور بے تامل پچاس ساٹھ مسلمانوں کو کاذب اور فریبی ٹھہرا دیا اور (آگے آیت) کلام الٰہی سے اپنے فتوے کی تصدیق بھی حسب معمول فرما دی، شاید ظن مومن کی یہی تعریف ہو۔ مگر یہ مسائل مذہبی ہیں اور میں محض سگِ دنیا، البتہ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ یہ طریقۂ اخبار نویسی خواہ لکھنے والے کے لئے کتنا ہی دل خوش کن اور عوام کے لئے کیسا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، جن پر سب وشتم کی بوچھار پڑتی ہے ان کے لئے ضرور بہت کچھ دل شکن ہے''۔

(ضیاء الحسن فاروقی ماہنامہ جامعہ اپریل ۱۹۷۹ء ص ۱۰۳)

مولانا آزاد نے بھی جوابی وار کیا، لکھتے ہیں:

''آپ نے ''آزادی کا بدرِ کامل'' اگر محض ''ہلال'' کے لئے لکھا ہے تو اس زورِ عبارت سے خود بھی مزہ لیتا ہوں، لیکن اگر طنزاً ہے تو مزاح سے الگ ہو کر مجھے کہنے دیجئے کہ آزادی اور آزاد بیانی کے درجہ کو تو اپنی بساط سے بہت بلند سمجھتا ہوں۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے جن قربانیوں اور خود فروشیوں کی ضرورت ہے وہ ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہوسکتیں۔ میرے دل میں تو ایک لمحہ کے لئے بھی اس دعوے کا خطرہ نہیں گذرا مگر میری محرومی سے آزادی کی آواز دنیا سے معدوم نہیں ہوسکتی۔ اس کو مجھ

میں نہ ڈھونڈیئے۔ البتہ اس کی آواز اُٹھے تو کانوں کو بند بھی نہ کیجئے۔

منکر نتواں گشت اگر دم زغم از عشق
ایں نشہ بمن گر نبود بادِ گرے ہست

(ایضاً ۱۰۳،۱۰۴)

محمد علی جوہر بھی وار کرنے سے کب چوکتے، اس کا بھی جواب دیا۔ لیکن وہی شائستہ اور شگفتہ انداز میں:

''آپ متعجب ہیں کہ ''ظن المومنین خیرا'' کی کیا یہی تعریف ہے کہ کمیٹی کو ایسے سخت الزام دیئے جائیں؟ لیکن آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ آخر حسن ظن کی کوئی حد بھی تو ہونی چاہئے۔ برسوں مسلمانوں نے اپنے لیڈروں کے ساتھ حسنِ ظن سے کام لیا لیکن اس حسن ظن کا جو نتیجہ نکلا وہ آپ کے دل میں اور میری زبان پر ہے۔ اب تو کچھ دنوں سوءظن ہی سے کام لینے دیجئے۔ آپ نے ''سگِ دنیا'' کے لقب کی ٹوپی خود ہی اپنے سر اوڑھ لی۔ حالانکہ جن سروں کے لئے قطع کی گئی تھی ان کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں' گو آپ اس طرف اشارہ نہ کریں۔ حیران ہو کہ آپ کو کسی خیال میں اپنے سے مختلف نہیں پاتا، لیکن پھر دیکھتا ہوں تو بہت دور ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ جام تو آپ کے ہاتھ میں بھی ہے مگر ''فسق'' کے الزام کے لئے میرا ہی وجود موزوں ہے:

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نام فسق'' (۱۰۴)

اس کے بعد مولانا آزاد نے فروری اور مارچ ۱۹۱۳ء کی الہلال کی اشاعتوں میں ''حدیث الغاشیہ'' کے عنوان سے اور ''نشۂ نیم شبی کا صبح خمار'' کے تحت عنوان کے تحت مولانا محمد علی کے انقلابِ حال پر پھبتیاں کسی ہیں۔

گرچہ کہ وہ بادہ و ساغر کی زبان میں ہیں کہیں کہیں صاف نام بھی لیا ہے۔ مولانا محمد علی نے بھی اس کا جواب دیا۔ وہی طرز اپنایا جو مولانا آزاد نے اختیار کیا تھا۔ لیکن دونوں کا انداز بیان شائستہ اور سلجھا ہوا نظر آتا ہے۔

مولانا محمد علی نے مولانا آزاد اور علامہ اقبال کو اپنا مذہبی استاد تسلیم کیا ہے۔ مولانا کی ذہانت اور ذکاوت کی خوب تعریف کرتے ہیں اور ان کو ایک اچھے مقرر بھی مانتے ہیں۔ ایک جگہ ہمدرد میں لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام سے میری رقابت کی حقیقت یہ ہے کہ میں ہر جگہ اس کی شہادت دینے کو تیار ہوں کہ مولانا کی ذکاوت و ذہانت مجھ سے کہیں زیادہ ہے''۔

(ماہنامہ نیادور لکھنؤ، جوہر نمبر ۱۹۸۶ء ص ۲۰۵)

اِن دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے پر جو اعتراض کئے ہیں اس میں کہیں بھی ذاتیات کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہے۔ صرف قوم و ملک کا مفاد عزیز تھا۔ اختلافی نظریات کے پیچھے کبھی بھی اپنی انا کو دخیل ہونے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں مولانا جوہر آزادیٔ کامل کا مطالبہ کرتے ہوئے دیارِ غیر میں اپنی جان قربان کر دی اور مولانا آزاد تقسیم کا تلخ گھونٹ پی کر بھی ہندوستان ہی میں اپنی ناقابل فراموش خدمات سے مسلمانوں کے لیے ہمیشہ کے لیے وقار اور تمکنت کا باعث بنے۔ اور سیاست، صحافت اور ادب میں ایسے نقوش چھوڑے کہ آنے والی نسل ہمیشہ اس سے مستفیض ہوتی رہے گی۔

○○○

A Research & Refereed Jounal (ISSN-2249-7854)

اردو جرنل ۱۲

۲۰۲۱

شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی کا اکیڈمک ریسرچ اینڈ ریفریڈ جرنل

اکبر الہ آبادی **گوشے** ساحر لدھیانوی

مدیر

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

فہرست

اپنی بات	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	۵

بوستان اکبر

اکبری تنقید اور تنقید اکبر	پروفیسر محمد حسن	۱۰
افکار اکبر الہ آبادی کی عصری معنویت	پروفیسر قدوس جاوید	۱۶
الہ آبادی کی شعری روایت اور اکبر-----	پروفیسر علی احمد فاطمی	۲۷
اکبر الہ آبادی کی قرأت نو	پروفیسر ابوبکر عباد	۴۰
اکبر الہ آبادی کا تصور اخلاقیات	ڈاکٹر آفتاب احمد منیری	۴۹
حضرت شاہ اکبر داناپوری اور اکبر الہ آبادی	مولانا سید شاہ محمد ریان	۵۳
کلام اکبر الہ آبادی میں مزاحمتی رویہ	ڈاکٹر شیخ فاروق باشا	۶۳
اکبر الہ آبادی کی غزل گوئی	ڈاکٹر ظفر انصاری ظفر	۶۸
اکبر کی حمایت میں	ڈاکٹر محمد شارب	۷۴
اکبر کی طنزیہ شاعری میں مذہبی افکار	ڈاکٹر ارشاد سیانوی	۸۳

گلہائے نو:-

اکبر الہ آبادی کی شاعری مغربی تہذیب---	محمد رضا اظہری	۹۲
اکبر الہ آبادی کی شعری جہات	شمس الدین ملک	۹۷
اکبر الہ آبادی کی شاعری میں سیاسی وسماجی فکر	ڈاکٹر ضمیر رضا	۱۰۲
اکبر الہ آبادی کی شاعری کے مختلف عناصر	ڈاکٹر نعمت شمع	۱۰۵
اکبر الہ آبادی کی شاعری میں اخلاقی قدریں	شمع کوثر شمع	۱۱۱
شہنشاہ طنز وظرافت: اکبر الہ آبادی	ڈاکٹر فائزہ احمد	۱۱۷
اکبر الہ آبادی: قوم وملت کا مسیحا	ڈاکٹر ممتاز جہاں	۱۲۰
اکبر الہ آبادی کی عشقیہ شاعری	محمد علیم الدین شاہ	۱۲۴

فہرست

اپنی بات	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	5

بوستان اکبر

اکبیری تنقید اور تنقید اکبر	پروفیسر محمد حسن	۱۰
افکار اکبر الہ آبادی کی عصری معنویت	پروفیسر قدوس جاوید	۱۶
الہ آباد کی شعری روایت اور اکبر۔۔۔۔۔	پروفیسر علی احمد فاطمی	۲۷
اکبر الہ آبادی کی قرأت نو	پروفیسر ابوبکر عباد	۴۰
اکبر الہ آبادی کا تصور اخلاقیات	ڈاکٹر آفتاب احمد منیری	۴۹
حضرت شاہ اکبر داناپوری اور اکبر الہ آبادی	مولانا سید شاہ محمد ریان	۵۳
کلام اکبر الہ آبادی میں مزاحمتی رویہ	ڈاکٹر شیخ فاروق باشا	۶۳
اکبر الہ آبادی کی غزل گوئی	ڈاکٹر ظفر انصاری ظفر	۶۸
اکبر کی حمایت میں	ڈاکٹر محمد شارب	۷۴
اکبر کی طنزیہ شاعری میں مذہبی افکار	ڈاکٹر ارشاد سیانوی	۸۳

گلہائے نو:۔

اکبر الہ آبادی کی شاعری مغربی تہذیب۔۔۔	محمد رضا اظہری	۹۲
اکبر الہ آبادی کی شعری جہات	شمس الدین ملک	۹۷
اکبر الہ آبادی کی شاعری میں سیاسی وسماجی فکر	ڈاکٹر ضمیر رضا	۱۰۲
اکبر الہ آبادی کی شاعری کے مختلف عناصر	ڈاکٹر نعمت شمع	۱۰۵
اکبر الہ آبادی کی شاعری میں اخلاقی قدریں	شمع کوثر شمع	۱۱۱
شہنشاہ طنز وظرافت: اکبر الہ آبادی	ڈاکٹر فائزہ احمد	۱۱۷
اکبر الہ آبادی: قوم وملت کا مسیحا	ڈاکٹر ممتاز جہاں	۱۲۰
اکبر الہ آبادی کی عشقیہ شاعری	محمد علیم الدین شاہ	۱۲۴

گلشن ساحر

امید ونشاط کا شاعر: ساحر لدھیانوی	پروفیسر علی احمد فاطمی	۱۲۸
ساحر لدھیانوی کی دو نظمیں: ایک جائزہ	پروفیسر اسلم جمشید پوری	۱۳۴
ساحر لدھیانوی کی فلمی اور غیر فلمی شاعری کا۔۔۔	ڈاکٹر عبدالحنان سبحانی	۱۳۸

ڈاکٹر شیخ فاروق باشا
لیکچرار، شعبہء اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، رائے چوٹی، آندھرا پردیش

کلام اکبر الہ آبادی میں مزاحمتی رویہ

لسان العصر اکبر الہ آبادی کی ولادت اس وقت ہوئی جب کہ سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ ٹمٹا رہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ظالم شکنجہ تقریباً سارے ہندوستان کو جکڑ چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد ہندوستانیوں کی رہی سہی طاقت توڑ دی گئی۔ اس وقت اکبر الہ آبادی کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ انگریزوں کے ظلم واستبداد کا نقش ہمیشہ کے لیے ان کے دل ودماغ پر مرتسم ہوگیا۔ بغاوت کے بعد ہندوستانی خصوصاً مسلم قوم انگریزوں کے عتاب کا شکار رہی۔ خوف ودہشت، ذلت ورسوائی، فقر وفاقہ اور غلامی ومحکومی ان کا مقدر بن گئی۔ اسی زمانے میں محسن قوم وملت سرسید احمد خاں نے محسوس کیا کہ انگریزی حکومت سے مبارزت کے بجائے مصالحت کا رویہ اپنانا چاہیے، عداوت کے بجائے رفاقت کا راستہ اختیار کیا جائے، سرسید نے اپنی قوم کو مغربی علوم سے استفادہ کرنے کی تلقین کی۔ اس سلسلہ میں ان کے تعلیمی کارنامے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

ہندوستان پر انگریزی حکومت کا جب پوری طرح تسلط ہو چکا تو انہوں نے مسلم قوم پر طرح طرح کے مظالم شروع کردیے۔ قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوگیا، سرکاری ملازمتوں سے انہیں کنارہ کش کیا گیا، جاگیریں، مناصب اور وظیفے ختم کردیے گئے۔ بہت سے لوگوں کو کالے پانی کی سزا سنائی گئی۔ کل تک جو برسراقتدار تھے آج وہ محکوم، مجبور اور مقہور ہو گئے۔ بقول میر تقی میرؔ

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا

مغربی نظام تعلیم کا رواج، مغربی تہذیب کا جنون، مغرب کی کورانہ تقلید، عریانیت اور فیشن پرستی، اختلاط مردوزن، الحاد پرستی، مفاد پرستی، غلامانہ ذہنیت، عیسائیت کی تبلیغ جیسے امور ہندوستان میں پنپ رہے تھے جن کی روک تھام کے لیے اکبر الہ آبادی کو شدید مزاحمت کرنی پڑی۔ مزاحمت، مصالحت اور مفاہمت کی ضد ہے۔ چونکہ برسراقتدار حکومت کے خلاف مزاحمت ہے اس لیے انہوں نے راست اور سنجیدہ تیر ونشتر چھوڑنے کے بجائے طنز ومزاح کا اسلوب اختیار کیا۔ برسراقتدار حکومت کے خلاف، آواز اٹھانا، ناخوشگوار اور ناسازگار حالات میں صدائے حق بلند کرنا، گویا اپنی موت کو آواز دینا تھا۔ لیکن اکبر الہ آبادی نے یہ کام بڑی خوبی اور ہمت سے کیا۔ کبھی اشارے

ڈاکٹر شیخ فاروق باشا

لیکچرار، شعبہء اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، رائے چوٹی، آندھرا پردیش

کلام اکبر الہ آبادی میں مزاحمتی رویہ

لسان العصر اکبر الہ آبادی کی ولادت اس وقت ہوئی جب کہ سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ ٹمٹا رہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ظالم شکنجہ تقریباً سارے ہندوستان کو جکڑ چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد ہندوستانیوں کی رہی سہی طاقت توڑ دی گئی۔ اس وقت اکبر الہ آبادی کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ انگریزوں کے ظلم و استبداد کا نقش ہمیشہ کے لیے ان کے دل و دماغ پر مرتسم ہوگیا۔ بغاوت کے بعد ہندوستانی خصوصا مسلم قوم انگریزوں کے عتاب کا شکار رہی۔ خوف و دہشت، ذلت و رسوائی، فقر و فاقہ اور غلامی و محکومی ان کا مقدر بن گئی۔ اسی زمانے میں محسن قوم و ملت سر سید احمد خاں نے محسوس کیا کہ انگریزی حکومت سے مبارزت کے بجائے مصالحت کا رویہ اپنانا چاہیے، عداوت کے بجائے رفاقت کا راستہ اختیار کیا جائے، سر سید نے اپنی قوم کو مغربی علوم سے استفادہ کرنے کی تلقین کی۔ اس سلسلہ میں ان کے تعلیمی کارنامے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

ہندوستان پر انگریزی حکومت کا جب پوری طرح تسلط ہو چکا تو انہوں نے مسلم قوم پر طرح طرح کے مظالم شروع کر دیے۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوگیا، سرکاری ملازمتوں سے انہیں کنارہ کش کیا گیا، جاگیریں، مناصب اور وظیفے ختم کر دیے گئے۔ بہت سے لوگوں کو کالے پانی کی سزا سنائی گئی۔ کل تک جو برسر اقتدار تھے آج وہ محکوم، مجبور اور مقہور ہو گئے۔ بقول میر تقی میرؔ

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا

مغربی نظام تعلیم کا رواج، مغربی تہذیب کا جنون، مغرب کی کورانہ تقلید، عریانیت اور فیشن پرستی، اختلاط مرد و زن، الحاد پرستی، مفاد پرستی، غلامانہ ذہنیت، عیسائیت کی تبلیغ جیسے امور ہندوستان میں پنپ رہے تھے جن کی روک تھام کے لیے اکبر الہ آبادی کو شدید مزاحمت کرنی پڑی۔ مزاحمت، مصالحت اور مفاہمت کی ضد ہے۔ چونکہ برسر اقتدار حکومت کے خلاف مزاحمت ہے اس لیے انہوں نے راست اور سنجیدہ تیر و نشتر چھوڑنے کے بجائے طنز و مزاح کا اسلوب اختیار کیا۔ برسر اقتدار حکومت کے خلاف، آواز اٹھانا، ناخوشگوار و ناسازگار حالات میں صدائے حق بلند کرنا، گویا اپنی موت کو آواز دینا تھا۔ لیکن اکبر الہ آبادی نے یہ کام بڑی خوبی اور ہمت سے کیا۔ کبھی اشارے

اور کنایے میں مزاحمت کی، کبھی دبے الفاظ اور دھیمے لہجہ میں، کبھی کھل کر بھی مزاحمتی رویہ اختیار کیا اور مختلف اشاروں ،علامتوں اور استعاروں میں اپنی مزاحمت پیش کی۔ چند علامتیں پیش ہیں۔

بت، انگریزوں کی علامت، پیر اور مرشد، سر سید احمد خاں کی علامت، اونٹ مسلمانوں کی، گائے ہندوؤں کی، برہمن ہندوؤں کی مذہبی جماعت کا نمائندہ، جہاز اور کشتی ملک کی، زاغ اور الو انگریزں کے نقالوں کی، بدھو عام مسلمانوں کی علامت ہے۔ اکبر نے ان علامتوں کو بعض جگہ واضح بھی کیا ہے۔

بدھو سے صرف ہند کا مسلم مراد ہے ۔۔۔ مقصود عاجزی ہے غرور اک فساد ہے
دل مرا جس سے بہلتا، کوئی ایسا نہ ملا ۔۔۔ بت کے بندے ملے، اللہ کا بندہ نہ ملا
واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے ۔۔۔ کردیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا

رشید احمد صدیقی اکبر الہ آبادی کے مزاحمتی رویہ کے تعلق سے کہتے ہیں۔

”حوصلہ و ہوس کی، الفت و آویزش کی، پیش قدمی و پسپائی کی، شور و سکوت کی اور سود و زیاں کی اکبر کی شاعری میں جلوہ گری ہے۔ کہیں خفی، کہیں جلی، کہیں شگفتہ، کہیں حزیں لیکن ہر جگہ دلنشیں، اس عہد کے سیاسی شعور کو سمجھنے کے لیے اکبر کے کلام سے ہر طرح کی مدد لی جاسکتی ہے، شاید اتنی قیمتی مدد کہیں اور سے حاصل بھی نہیں ہو سکتی“۔

اکبر الہ آبادی نے سب سے زیادہ مغربی تہذیب سے مزاحمت کا رویہ اپنایا ہے۔ وہ مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے اور مشرقی تہذیب کی اساس اور بنیاد، مذہب، روحانیت اور اخلاق پر ہے۔ مغربی تہذیب کی بنیاد الحاد ، مادیت اور فحاشی پر ہے۔ اکبر اپنی قوم کو اس تہذیب کی پرچھائیوں سے بچانا چاہتے تھے۔ یہ امر مسلم ہے کہ محکوم قوم بہت جلد حاکم قوم کی کورانہ تقلید کرتی ہے۔

مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کے خلاف اردو زبان کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے مزاحمتی رویہ اپنایا ہے لیکن اس سلسلہ میں شاعر مشرق علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی سب سے بیش پیش نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال کی مزاحمت کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اکبر الہ آبادی نے بھی جابجا اپنے کلام میں طنز و مزاح کے پیرائے میں مغربی تہذیب پر وار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کرلی ۔۔۔ نئے صنم کی تمنا میں خودکشی کرلی
تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی ۔۔۔ چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی

واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر　　پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

اکبرالہ آبادی کو یہ خوف شدید تھا کہ مغربی تہذیب وتمدن مسلم قوم کو اخلاقی انحطاط کے سمندر میں ڈبو دے گی۔آخر ہوا بھی یہی۔

نئی تہذیب سے ساقی نے ایسی گرمجوشی کی　　کہ آخر مسلموں میں روح پھونکی بادہ نوشی کی

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

تہذیب نو کے رنگ پر بلبل بنے ہیں سب　　واللہ کیا بہار ہے اس سبز باغ میں

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے　　نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

اکبرالہ آبادی ایک مشرقی تہذیب کے پیروکار اور مذہب پسند شخص تھے،مغربی تہذیب کی اندھی تقلید سے انہیں مشرقی تہذیب کے اعلیٰ اقدار خطرے میں دکھائی دے رہے تھے،بے حیائی اور فیشن پرستی کی وبا عام ہو رہی تھی۔حقوق نسواں اور مساوات مردوزن کی آڑ میں مغربی دنیا نے خواتین کو سڑکوں پر مردوں کے برابر لا کھڑا کر دیا تھا۔اکبر نے خواتین کو عریانی اور فحاشی سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ایک رباعی میں خواتین کی بے حیائی اور بے حجابی کے تعلق سے کہتے ہیں۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں　　اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا　　کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

برطانوی حکومت نے حصول اقتدار کے بعد اس بات کی کوشش کی کہ مشرقی طرز تعلیم کا سد باب کیا جائے تا کہ ان میں مذہب سے بیزاری،قدامت پسندی اور اعلیٰ اقدار کا فقدان ہو چنانچہ انہوں نے مغربی طرز تعلیم ہندوستان بھر میں رائج کرنا شروع کر دیا۔جدید فلسفہ اور سائنسی علوم کو عام کر دیا تا کہ مذہبی عقائد اور روایات کی قدر ومنزلت کم ہو۔مسلمانوں میں مغربی تہذیب کے پیروکار اور تقلید کرنے والے پیدا ہوں۔برطانوی حکومت کے لیے کم تنخواہ پر کام کرنے والے ملازمین ہندوستان ہی میں مل جائیں،انگلستان سے نہ منگوانا پڑے اور یہ فکر دی گئی کہ برطانوی تہذیب اور معاشرت خوشحالی اور ترقی کی علامت ہے اور مشرقی تہذیب تنزلی وانحطاط کی علامت، ان مقاصد کے حصول کے لیے نئے تعلیمی نصاب اور نئی تعلیمی پالیسوں کو نافذ کیا گیا۔ایسے میں اکبرالہ آبادی کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ نئی تعلیمی پالیسی سے تہذیب وتمدن،دینی وملی غیرت،ہمدردی اور رحمدلی ختم ہو جائے گی۔ محض دولت حاصل کرنا،ڈگری پانا،نوکری کرنا اور پنشن لینا ہو جائے گا۔ان خیالات کا کھل کر اپنی شاعری میں اظہار خیال کیا ہے۔کہتے ہیں:

میں کیا کہوں احباب کیا کار نمایاں کر گئے　　بی اے کیا،نوکر ہوئے،پنشن ملی اور مر گئے

ایک اور شعر یوں ہے۔

واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر
پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

اکبر الہ آبادی کو یہ خوف شدید تھا کہ مغربی تہذیب وتمدن مسلم قوم کو اخلاقی انحطاط کے سمندر میں ڈبو دے گی۔ آخر ہوا بھی یہی۔

نئی تہذیب سے ساقی نے ایسی گرمجوشی کی
کہ آخر مسلموں میں روح پھونکی بادہ نوشی کی

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

تہذیب نو کے رنگ پر بلبل بنے ہیں سب
واللہ کیا بہار ہے اس سبز باغ میں

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

اکبر الہ آبادی ایک مشرقی تہذیب کے پیروکار اور مذہب پسند شخص تھے، مغربی تہذیب کی اندھی تقلید سے انہیں مشرقی تہذیب کے اعلی اقدار خطرے میں دکھائی دے رہے تھے، بے حیائی اور فیشن پرستی کی وبا عام ہو رہی تھی۔ حقوق نسواں اور مساوات مرد وزن کی آڑ میں مغربی دنیا نے خواتین کو سڑکوں پر مردوں کے برابر لا کھڑا کر دیا تھا۔ اکبر نے خواتین کو عریانی اور فحاشی سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ ایک رباعی میں خواتین کی بے حیائی اور بے حجابی کے تعلق سے کہتے ہیں۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

برطانوی حکومت نے حصول اقتدار کے بعد اس بات کی کوشش کی کہ مشرقی طرز تعلیم کا سدباب کیا جائے تاکہ ان میں مذہب سے بیزاری، قدامت پسندی اور اعلی اقدار کا فقدان ہو چنانچہ انہوں نے مغربی طرز تعلیم ہندوستان بھر میں رائج کرنا شروع کر دیا۔ جدید فلسفہ اور سائنسی علوم کو عام کر دیا تاکہ مذہبی عقائد اور روایات کی قدر ومنزلت کم ہو۔ مسلمانوں میں مغربی تہذیب کے پیروکار اور تقلید کرنے والے پیدا ہوں۔ برطانوی حکومت کے لیے کم تنخواہ پر کام کرنے والے ملازمین ہندوستان ہی میں مل جائیں، انگلستان سے نہ منگوانا پڑے اور یہ فکر دی گئی کہ برطانوی تہذیب اور معاشرت خوشحالی اور ترقی کی علامت ہے اور مشرقی تہذیب تنزلی وانحطاط کی علامت، ان مقاصد کے حصول کے لیے نئے تعلیمی نصاب اور نئی تعلیمی پالیسوں کو نافذ کیا گیا۔ ایسے میں اکبر الہ آبادی کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ نئی تعلیمی پالیسی سے تہذیب وتمدن، دینی وملی غیرت، ہمدردی اور رحمدلی ختم ہو جائے گی۔ محض دولت حاصل کرنا، ڈگری پانا، نوکری کرنا اور پنشن لینا ہو جائے گا۔ ان خیالات کا کھل کر اپنی شاعری میں اظہار خیال کیا ہے۔ کہتے ہیں:

میں کیا کہوں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے

ایک اور شعر یوں ہے۔

پڑھ کر انگریزی میں دانا ہو گیا   "کم" کا مطلب ہی کمانا ہو گیا

اکبر الہ آبادی کے خیال میں تعلیم وہ واحد ذریعہ ہے جس سے قوموں کے قلوب واذہان کو غلام بنایا جاسکتا ہے، یہ ایسا مؤثر ہتھیار ہے جو قتل وخون سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اپنے ایک مشہور شعر میں اس خیال کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا   افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

قوم کے تعلیمی رہنما اور سماجی مصلح سرسید احمد خاں کے تعلیمی افکار سے اکبر الہ آبادی مطمئن نہیں تھے کیونکہ ان کے خیال میں علی گڑھ کا تعلیمی مرکز ظاہری چمک دمک اور دنیاوی ترقی کی حد تک محدود ہو گیا تھا۔ یہاں کے تعلیم یافتہ مادیت اور عقلیت کو سب کچھ سمجھ رہے تھے۔ وہ سرسید اور علی گڑھ کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہتے ہیں۔

ابتدا کی جناب سید نے جن کے کالج کا اتنا نام ہوا

انتہا یونیورسٹی پر ہوئی، قوم کا کام اب تمام ہوا

اس فکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا   حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

مل کا آٹا ہے نل کا پانی ہے   آب و دانہ کی حکمرانی ہے

مغربی علوم وفنون، کے خلاف مزاحمتی رویہ کو دیکھ کر کوئی یہ خیال نہ کرے کہ اکبر جدید تعلیم اور علوم وفنون، صنعت وحرفت کے مخالف ہیں۔ انہوں نے صرف تعلیم کے نام پر مرد وزن کے اختلاط، بے پردگی، مغربی فیشن پرستی اور ناچ گانے پر چوٹ کی ہے۔ ہر حال میں دینی مزاج اور مذہب کو قابل نمونہ سمجھنے کی تلقین کی ہے۔ ان کے چند اشعار اس بات کی غمازی کرتے ہیں۔

دو باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو   اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو

بڑھاؤ تجربے، اطراف دنیا میں سفر سیکھو   خواص خشک و تر سیکھو علوم بحر و بر سیکھو

دینی غیرت اور حمیت کو ابھارتے ہوئے کہتے ہیں۔

خدا کے واسطے اے نوجوانو، ہوش میں آؤ   دلوں میں اپنی غیرت کو جگہ دو، جوش میں آؤ

ایک اور جگہ اسی خیال کو پیش کرتے ہوئے مذہب اور دین کو سرچشمہ ہدایت سمجھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

تم شوق سے کالج میں پھلو، پارک میں پھولو   جائز ہے غباروں میں اڑو، چرخ پہ جھولو

بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد   اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

... گے وہاں سائنسی ایجادات

پڑھ کر انگریزی میں دانا ہوگیا ''کم'' کا مطلب ہی کمانا ہو گیا

اکبرالہ آبادی کے خیال میں تعلیم وہ واحد ذریعہ ہے جس سے قوموں کے قلوب واذہان کو غلام بنایا جاسکتا ہے، یہ ایسا مؤثر ہتھیار ہے جو قتل وخون سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اپنے ایک مشہور شعر میں اس خیال کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

قوم کے تعلیمی رہنما اور سماجی مصلح سرسید احمد خاں کے تعلیمی افکار سے اکبرالہ آبادی مطمئن نہیں تھے کیونکہ ان کے خیال میں علی گڑھ کا تعلیمی مرکز ظاہری چمک دمک اور دنیاوی ترقی کی حد تک محدود ہوگیا تھا۔ یہاں کے تعلیم یافتہ مادیت اور عقلیت کو سب کچھ سمجھ رہے تھے۔ وہ سرسید اور علی گڑھ کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہتے ہیں۔

ابتدا کی جناب سید نے جن کے کالج کا اتنا نام ہوا

انتہا یونیورسٹی پر ہوئی قوم کا کام اب تمام ہوا

اس فکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

مل کا آٹا ہے نل کا پانی ہے آب و دانہ کی حکمرانی ہے

مغربی علوم وفنون، کے خلاف مزاحمتی رویہ کو دیکھ کر کوئی یہ خیال نہ کرے کہ اکبر جدید تعلیم اور علوم وفنون ،صنعت وحرفت کے مخالف ہیں۔ انہوں نے صرف تعلیم کے نام پر مردوزن کے اختلاط، بے پردگی ،مغربی فیشن پرستی اور ناچ گانے پر چوٹ کی ہے۔ ہرحال میں دینی مزاج اور مذہب کو قابل نمونہ سمجھنے کی تلقین کی ہے۔ان کے چند اشعار اس بات کی غمازی کرتے ہیں۔

وہ باتیں جن سے قومیں ہورہی ہیں نامور سیکھو اٹھو تہذیب سیکھو ،صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو

بڑھاؤ تجربے ،اطراف دنیا میں سفر سیکھو خواص خشک و تر سیکھو علوم بحر و بر سیکھو

دینی غیرت اور حمیت کو ابھارتے ہوئے کہتے ہیں۔

خدا کے واسطے اے نوجوانو ،ہوش میں آؤ دلوں میں اپنی غیرت کو جگہ دو ،جوش میں آؤ

ایک اور جگہ اسی خیال کو پیش کرتے ہوئے مذہب اور دین کو سرچشمہ ہدایت سمجھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

تم شوق سے کالج میں پھلو، پارک میں پھولو جائز ہے غباروں میں اڑو ،چرخ پہ جھولو

بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اکبرالہ آبادی اس خیال کی پرزور مخالفت کرتے ہیں کہ انگریز جہاں جائیں گے وہاں سائنسی ایجادات اور ٹکنالوجی ترقی کرے گی۔ ایجادات ان ملکوں میں بھی ہیں جہاں انگریز حکمران نہیں ہیں۔جدید ایجادات کی

مخالفت انہوں نے کبھی نہیں کی بلکہ اس کے سیکھنے پر ابھارا ہے۔وہ کہتے ہیں۔

عزم کر تقلید مغرب کا ہنر کے زور سے　　　لطف کیا جو لد لیے موٹر پر زر کے زور سے

ان کے علاوہ الحاد پرستی کے خلاف بھی ان کی مزاحمت قابل قدر ہے۔وہ کہتے ہیں۔

صدائے الحاد اٹھ رہی ہے خدا کی اب یاد اٹھ رہی ہے　　　دلوں سے فریاد اٹھ رہی ہے کہ دین سے ہم گزر رہے ہیں

غرض اکبرالہ آبادی نے اپنے قلم وقرطاس کے ذریعہ ہراس ناخوشگوار اور نامناسب رویے کے خلاف مزاحمت کی جو ہمارے ملک میں پنپ رہے تھے، سماجی برائیوں، معاشرتی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی، حالانکہ وہ حکومت کے اعلی عہدوں پر قائم رہے اس کے باوجود حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔اور یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ اردو کے مزاحمتی ادب میں اکبرالہ آبادی کا احتجاجی اور مزاحمتی رویہ بہت توانا دکھائی دیتا ہے۔

بہار کی بہار (جلد اول ودوم)

مصنف۔پروفیسر اعجاز علی ارشد

بہار کی ادبی وتہذیبی تاریخ کا دستاویزی سلسلہ

ملنے کا پتہ

بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

ISSN 2321-4627

ڈسمبر 2021ء
-/15روپے

ماہنامہ

قومی زبان

حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی وسائنسی جریدہ

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad

مولانا محمد علی جوہر

مرزا اسداللہ خان غالبؔ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی اردو مسکن خلوت حیدرآباد میں اردو اکیڈیمی کے مرکزی دارالمطالعہ و تحقیقی مرکز کے زیر اہتمام بضمن ''نیشنل لائبریری ویک''14 تا 20 نومبر 2021 بعنوان ''طلبہ کی ذہن سازی میں کتب خانوں کا رول''منعقدہ ادبی اجلاس سے صدارتی خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں ڈاکٹر محمدی اسریٰ سلطانہ' اسسٹنٹ پروفیسر حسینی علم ڈگری کالج برائے اناث' ڈاکٹر محمد عبدالقدوس اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو حسینی علم ڈگری کالج برائے اناث' جناب سردار سلیم و دیگر دیکھے جاسکتے ہیں

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش (عالمی یوم اردو اور قومی یوم تعلیم) کے ضمن میں ہائی اسکول' جونیر و ڈگری کالج' یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات و ریسرچ اسکالرس کے لئے منعقدہ تحریری مقابلوں کے کامیاب طلباء و طالبات میں ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر/سکریٹری اردو اکیڈیمی کے ہاتھوں انعامات کی تقسیم عمل میں لائی گئی۔ اس موقع پر لی گئی تصویر میں ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر/سکریٹری کے علاوہ کنویزس ڈاکٹر محمد ناظم علی' محمد مصطفیٰ علی سروری' ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی' ڈاکٹر محمد عبدالقدوس' ڈاکٹر جہانگیر احساس و انعام یافتگان دیکھے جاسکتے ہیں

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی' انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز اور حیدرآباد آرٹس اینڈ کلچرل اسوسی ایشن کے اشتراک سے 4 ڈسمبر 2021ء کو سالار ملت میموریل آڈیٹوریم' اردو مسکن' خلوت' موتی گلی' حیدرآباد ''شام قوالی'' کا اہتمام کیا گیا' جس میں ممتاز وارثی فیملی کے احمد برادرس نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔

قرینہ

ہم کلامی	ڈاکٹر محمد غوث	4

یادرفتگاں

غزل	مرزا اسداللہ خان غالبؔ	5
مرزا اسداللہ خان غالبؔ	حافظ ڈاکٹر صابر پاشاہ قادری	6
مولانا محمد علی جوہر کی انگریزی صحافت	ڈاکٹر شیخ فاروق باشا	11
ڈاکٹر زورؔ کی مقدمہ نگاری	ڈاکٹر جعفر جری	15
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	ڈاکٹر محمد عظمت اللہ خان احساسؔ	20

مضامین

''روشن ستارے'' برفلکِ ادبِ اطفال	قمر جمالی	28
ریاضی کا خوف: اسباب اور حل	جہانگیر عالم و ڈاکٹر علی حیدر	32
تحریکِ جنگ آزادی سے متعلق اردو میں تاریخیں	ڈاکٹر شہناز بیگم	40
ہندوستان میں مساوی مواقع کمیشن کی مطابقت: ایک تجزیہ	ڈاکٹر شیخ عبدالطہٰ	48
ہندوستان میں درج فہرست ذات اور درج فہرست قبائل کے لئے تحفظاتی پالیسی	محمد عبدالرحیم	55
حیدرآباد ریاست میں ریڈیو نشریات	محمد عقیل احمد (عقیل دانش)	60
قطب شاہی دور میں بچوں کے ادب کی نمائندگی	محمد رفیع الدین	64
ضلع ورنگل کے چند نامور شعراء	آمینہ اختر	67

افسانہ

ماں جی	قدرت اللہ شہاب	72

حصہ نظم

غزلیں	رشیدؔ شہیدی / راشد احمد راشدؔ	81
غزلیں	رحیم قمرؔ / سید تجید حیدر	82

oOo

ماہنامہ قومی زبان حیدرآباد

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کا علمی، ادبی، ثقافتی و تہذیبی ترجمان

QAUMI ZABAN Monthly, Hyderabad.

جلد : 06 شمارہ : 12 ڈسمبر 2021ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد غوث

ڈائریکٹر ر سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ناشر و طابع

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

چوتھی منزل، حج ہاؤز، نامپلی

حیدرآباد-001 500 (تلنگانہ)

مقام اشاعت : تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

ترتیب و تزئین : محمد ارشد مبین زبیری

کمپوزنگ، ڈیزائننگ : محمد اعظم علی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages : **84**

قومی زبان کی خریداری کے لیے چیک ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام ڈائرکٹر ر سکریٹری تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی روانہ کریں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

☆

''قومی زبان'' میں شائع شدہ مضامین میں اظہار کردہ خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

☆

Printed by Dr. Mohammed Ghouse and Published by Mohammed Ghouse on behalf of Telangana State Urdu Academy, Minorities Welfare Dept.,Govt.of Telangana, Printed at M/s. Taha Enterprises, Printing and Packaging, 11-6-833, Red Hills, Lakdi ka Pul, Hyderabad-500004, T.S..

Published at 4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad-500 001 Telangana State.
Ph: No. 040-23237810 Fax: 040-66362931
Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
website : urduacademyts.com

ہم کلامی

ہم نے سال 2021 کے آخری مہینے یعنی ماہ ڈسمبر کے شمارے کی ابتداء ''یادرفتگاں'' کے ذیلی عنوان کے تحت نامور شاعر و ادیب مرزا اسداللہ خان غالبؔ پر حافظ و ڈاکٹر صابر پاشاہ قادری کے مضمون' عظیم مجاہد آزادی ممتاز صحافی وادیب مولانا محمد علی جوہر پر ڈاکٹر فاروق باشا کی تحریر' دکن کی معروف ادبی شخصیت ڈاکٹر محی الدین قادری زور پر ڈاکٹر جعفر جری اور ڈاکٹر محمد عظمت اللہ خان احساس کے مضامین سے کی ہے۔اس کے بعد تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام شائع ہونے والے بچوں کے رسالے ''روشن ستارے'' پر ممتاز فکشن نگار محترمہ قمر جمالی کا مضمون' جناب جہانگیر عالم اور ڈاکٹر حیدر علی کا ''ریاضی کا خوف: اسباب اور حل کے عنوان سے مشترکہ مضمون' ڈاکٹر شہناز بیگم کا ''تحریک جنگ آزادی سے متعلق اردو میں تاریخیں'' کے عنوان سے' خواجہ کوثر حیات کا ''نئی قومی پالیسی ایک غیر جانب دار جائزہ کے عنوان سے' ڈاکٹر شیخ عبدالطہٰ کا مضمون ''ہندوستان میں مساوی مواقع کمیشن کی مطابقت'' جناب محمد عبدالرحیم کا مضمون ''ہندوستان میں درج فہرست ذات اور درج فہرست قبائل کے لئے تحفظاتی پالیسی' حیدرآباد ریاست میں ریڈیو نشریات'' کے عنوان سے جناب محمد عقیل احمد کا مضمون ''قطب شاہی دور میں بچوں کے ادب کی نمائندگی'' کے عنوان سے محمد رفیع الدین کا مضمون ''ضلع ورنگل کے چند نامور شعراء'' کے عنوان سے محترمہ آمینہ اختر کی تحریر' اسی طرح نامور افسانہ نگار قدرت اللہ شہاب کا کلاسیکل افسانہ ''ماں جی' اور آخر میں حسب معمول حصہ نظم میں ممتاز شعرائے کرام جناب رشید شہیدی' جناب راشد احمد راشدؔ جناب رحیم قمر اور جناب سید تمجید حیدر کے کلام شائع کئے گئے ہیں۔ امید کہ یہ نگارشات ہمارے قارئین کی دلچسپی اور معلومات کا ذریعہ بنیں گی۔

تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی اپنے رسالے کے ذریعہ اس زبان کو موجودہ دور کے حساب سے سائنس وٹکنالوجی سے مربوط کررہی ہے' اس سلسلہ میں ہم نے ماہ اکتوبر کے شمارے کو ''سائنس نامہ'' کے عنوان سے شائع کیا جس کی سارے ہندوستان سے پذیرائی ہورہی ہے' ہم چاہتے ہیں کہ یہ سلسلہ جاری رہے اور ہر ماہ دو ایک مضامین سائنس وٹکنالوجی پر شائع ہوں' ہمارے مضمون نگار اس طرف توجہ کریں اور سائنس وٹکنالوجی پر اپنے مضامین روانہ کریں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ موجودہ حالات خاص کر کووِڈ 19 کی دوسری لہر نے انسانی وسائل کو نہ صرف متاثر کیا تھا بلکہ حکومتی آمدنی کو بھی شدید نقصان اٹھانا پڑا۔اس پس منظر میں مختلف حکومتی شعبوں نے اپنا بجٹ کم کرتے ہوئے سرگرمیوں کو انجام دیا جس میں اردو اکیڈیمی بھی شامل ہے۔مگر ان حالات میں بھی اردو اکیڈیمی فروغ اردو کے ضمن میں سال 21-2020 میں بیسٹ ٹیچر ایوارڈ و بیسٹ اردو اسٹوڈنٹ ایوارڈز کی تقسیم کے علاوہ بہت سارے اختراعی پروگرامس منعقد کرچکی ہے جن میں مختصر مدتی آن لائن اردو بنیادی کورس' مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے اشتراک سے اردو اساتذہ اور اردو اسکالرس کی تربیت' اسی طرح اردو صحافیوں اور شعراء کی تربیت' ڈاکٹر مری چنا ریڈی ایچ آر ڈی انسٹی ٹیوٹ کے اشتراک سے اردو اکیڈیمی کے ملازمین کی تربیت' ماہنامہ ''قومی زبان'' اور بچوں کے رسالے ماہنامہ ''روشن ستارے'' کی سالگرہ کے ضمن میں ادبی اجلاس' اس کے علاوہ اہم قومی دنوں اور دیگر مواقع پر طلبہ ونوجوانوں کے لئے تحریری مقابلہ جات' ڈگری کی نصابی کتابوں کی اشاعت' اہم اور تاریخی کتابوں کی اشاعت اور بھی کئی اختراعی پروگرامس منعقد کئے گئے۔اردو اکیڈیمی آئندہ دنوں میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی اور سیٹ وِن کے اشتراک سے اردو سے فارغ طلبہ کے لئے جاب میلہ منعقد کررہی ہے' علاوہ ازیں ایک سنجیدہ اور مزاحیہ مشاعرہ' تلنگانہ اقلیتی تعلیمی ادارہ جات سوسائٹی کے اشتراک سے ''جشن اردو'' اور عالمی اردو کانفرنس کی بھی تجویز ہے۔ہماری کوشش رہے گی کہ آنے والے سال میں بھی ہم فروغ اردو کے سلسلہ میں کچھ نئے پروگرامس ترتیب دیں۔

بہر حال محبان اُردو سے یہی توقع ہے کہ آنے والے سال کا استقبال ہم اس عزم وارادے سے کریں گے کہ ہم اپنی مادری زبان کی حفاظت کریں گے اور اپنے نونہالوں کو اس زبان سے واقف رکھیں گے۔اس کے ساتھ ساتھ اس زبان کو نئے دور سے ہم آہنگ کرنے کی ہر کوشش کا ساتھ دیں گے۔

آخر میں اس شعر کے ساتھ ہم اپنی بات کو ختم کرتے ہیں:ـ

نہ کوئی رنج کا لمحہ کسی کے پاس آئے
خدا کرے کہ نیا سال سب کو راس آئے

محمد غوث

ڈاکٹر محمد غوث
ایڈیٹر

دبیرالملک نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ
کی ایک خوبصورت غزل

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم ان کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما
کام گر رک گیا روا نہ ہوا

رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے
لے کے دل دل ستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

مرزا اسد اللہ خان غالب

یادِ رفتگاں

اُردو شاعری سے دِل چسپی نہ رکھنے والا بھی غالبؔ کے نام سے ضرور واقف ہے اور یہ واقفیت اس بات کی غماز ہے کہ عظمت کا تاج، اُردو شاعری کے بے تاج بادشاہ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے سَر ہے۔ غالبؔ کے گونا گوں کمالات میں سے ایک کمال اُن کی تعلّی بھی ہے۔ تعلّی، اُردو شاعری کی اصطلاح میں اپنی بڑائی کے اظہار کو کہتے ہیں۔ غالبؔ کی شاعرانہ تعلّی کے لیے یہاں اُن کے محض ایک شعر سے مدد لی جارہی ہے۔ تاہم، ذہن میں رکھنا ہوگا کہ یہ تعلّی اس قدر وزنی ہے کہ اس کا بوجھ کسی دوسرے شاعر سے شاید ہی اُٹھایا جاسکے۔ یہ شعر کچھ یوں ہے کہ:

ہیں اور بھی دُنیا میں سُخن وَر بہت اچّھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

دوسرے مصرعے کو خواہ جتنے بھی زاویوں سے پڑھیں، آپ کو غالبؔ کے ذہنِ رسا کی داد دینی ہی پڑے گی۔ مغل سلطنت کا آفتاب غروب ہوا چاہتا تھا لیکن غروب ہوتے ہوئے بھی لعل بدخشاں کے جو ڈھیر اس آفتاب نے چھوڑے ان میں سے ایک کو دنیا اسد اللہ خاں غالبؔ کے نام سے جانتی ہے۔ یہ زمانہ اگر چہ مغلیہ سلطنت کے سقوط کا تھا لیکن اردو شاعری کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ بہادر شاہ ظفر اگر چہ برائے نام بادشاہ تھے لیکن علم وفن کے قدرداں تھے' ادبی نورتنوں کو اپنے ہاں جمع کر رکھا تھا۔ پھر جہاں تک شعر وادب کا تعلق ہے، دہلی تو ایسی دلی تھی کہ چشم فلک نے پھر کبھی ایسی دلی نہیں دیکھی ہوگی۔ غالبؔ، ظفرؔ، شاہ نصیرؔ، مولوی فضلِ حق خیر آبادی، ذوقؔ، مومنؔ، امام بخش صہبائیؔ، میرؔ، مہدیؔ مجروح، ہر گوپال تفتہؔ، شیفتہؔ، حالیؔ، ہر ایک دُرِّ نایاب اپنی مثال آپ اور بے بدل تھا۔

غالبؔ نے ہر چند کہ 13-1812 سے دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی لیکن ان کا دلی آنا جانا تو اسی وقت سے تھا جب وہ سن شعور کو پہنچ چکے تھے۔ غالبؔ کے آبا واجداد کا وطن نہ تو دلی تھا اور نہ آگرہ۔ کہتے ہیں ان کے دادا مرزا قوقان بیگ جو تورانی نسل سے تعلق رکھتے تھے، سمرقند کے رہنے والے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے تیسرے حملے (دسمبر 1751ء تا مارچ 1752ء) سے ہندوستان ابھی سنبھل ہی رہا تھا کہ مرزا قوقان بیگ تلاش معاش میں یہاں آئے۔ پہلے تو وہ لاہور میں نواب معین الملک کے ہاں ملازم رہے پھر عالم گیر کے عہد میں دہلی پہنچے اور ڈیڑھ دو سال بعد شاہ عالم کی شہزادگی کے عہد میں شاہی ملازم ہوئے۔ پھر نجف خان کی ملازمت اختیار کی بعد ازاں وہاں سے مستعفی ہو کر مہاراجہ جے پور کے یہاں ملازم رہے۔ اس طرح آگرہ ان کی جائے سکونت بنا۔ مرزا قوقان بیگ کی شادی 1763ء میں ہوئی اور غالبؔ کے والد مرزا عبداللہ بیگ خاں 1765ء میں دہلی میں پیدا ہوئے جن کی شادی آگرے میں 1793ء میں خواجہ غلام حسین خاں کمیدان کی دختر عزت النساء بیگم سے ہوئی۔ ان کے بطن سے 27 دسمبر 1797ء بمطابق 8 رجب المرجب 1212ھ کو غالبؔ پیدا ہوئے۔ مرزا عبداللہ بیگ خاں نے کبھی حیدرآباد میں ملازمت کی تھی، بعد ازاں وہ ریاست الور کی فوج میں ملازم ہوئے۔ 1801ء میں

ایک گڑھی کے زمیندار سے مقابلہ کرتے ہوئے انھیں گولی لگ گئی اور وہ جانبر نہ ہوسکے۔ان کی تدفین الورہی میں عمل میں آئی غالبؔ نے اردوغزل گوئی میں اپنا الگ مقام بنایا وہ دوسروں کی راہ پر چلنے سے کتراتے تھے۔ ابتداء میں فارسی میں شاعری کرتے رہے۔ بعد میں اردو شاعری کی۔ غالبؔ کا اردو دیوان مختصر ہے۔لیکن اسے عالمی طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔ موضوعات اور انداز بیان میں جدت' شوخی' ظرافت اور دیگر زبان و بیان کی خوبیاں انہیں اردو کا ایک منفرد شاعر بناتی ہیں۔ غالبؔ نے بغیر القاب وآداب استعمال کئے آپسی گفتگو کی طرح خط لکھے جو بہت مشہور ہوئے۔ مجموعی طور پر غالبؔ نے اردو شاعری کو نئی فکر عطا کی اور آج بھی ان کی شاعری سے نئے مفاہیم تلاش کئے جارہے ہیں۔

غالبؔ کی شاعری میں جا بجا قلندرانہ صوفیانہ رنگ ملتا ہے ایک شعر دیکھیں کہ:

ہاں۔! بھلا کر تیرا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

اس مختصر سی زندگی میں انسان کیا کیا تکلیفیں اور دکھ برداشت کرتا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ انسان زندگی میں ملے مسلسل دکھوں ورنج سے دل برداشتہ ہوکر رونے کو مجبور ہوجاتا ہے اور پھر وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ:

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

انھیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ اللہ نے جس مقصد کے لیے انھیں اس دنیا میں بھیجا تھا اس کا حق اس سے شاید ادا نہ ہوسکا۔ اسی کے چلتے وہ خود پہ طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

اسی غزل کے ایک دوسرے شعر میں موت کے معین ومقرر ہونے کی حکایت کواس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

غالبؔ کواس بات کا بھی احساس تھا کہ اللہ پاک نے جوعقل سلیم اورتصوفانہ طبیعت وصلاحیت انھیں عطا کی ہے اگر وہ اس کا صحیح طریقہ سے یعنی خدا کے بتائے ہوئے احکام کے مطابق استعمال کرتے تو آج وہ یقیناً ایک ولی کی حیثیت میں ہوتے۔ملاحظہ فرمائیں:

یہ مسائلِ تصوف یہ تیرا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

غالبؔ کے کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جن میں وہ صحابہ کی سوچ وفکر پہ پہرا دیتے ہوئے دِکھائی دیتے ہیں۔ جیسے کہ حضرت ابوبکرؓ جنکے تعلق سے اللہ کے آخری پیغمبر حضرت محمدﷺ نے دنیا میں ہی جنتی ہونے کی بشارت دی ہے اس کے باوجود ابوبکرؓ یوم حشر میں اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونے سے کس قدر ڈرتے تھے کہ فرمایا کرتے تھے کہ کاش میں کوئی درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا،کبھی فرماتے کاش میں کوئی گھاس ہوتا کہ جانور اس کو کھالیتے،کبھی فرماتے کاش میں کسی مومن کے بدن کا بال ہوتا۔ایک مرتبہ باغ میں تشریف لے گئے اور ایک جانور کو بیٹھا

دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا اور فرمایا کہ تو کس قدر لطف میں ہے کہ کھاتا ہے پیتا ہے، درختوں کے سائے میں پھرتا ہے اور آخر میں تجھ سے کوئی حساب کتاب نہیں۔ کاش ابوبکرؓ بھی تجھ جیسا ہوتا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مذکورہ واقعہ میں پیش کیے خیالات کی ترجمانی غالبؔ نے اپنے درج ذیل اشعار میں کچھ اس انداز میں کی ہے کہ:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غالبؔ کو احساس تھا کہ ایک دن موت آنی ہے اور اس کے بعد انسان کو اپنے اچھے برے اعمال کا اللہ کے یہاں روز محشر میں حساب دینا ہے' یہی وجہ ہے کہ اپنے وجود پہ پچھتاوے کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں جب دنیا میں کچھ بھی نہیں تھا تو خدا تھا' اگر یہ دنیا کی سبھی چیزیں انسان وغیرہ وغیرہ نہ ہوتے، تب بھی خدا کی واحد ذات ہوتی۔ لیکن میرے ہونے نے گویا مجھے ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔ اگر میں دنیا میں پیدا نہ ہوا ہوتا تو روزِ جزا میں حساب کتاب دینے سے بچ جاتا۔ جہاں غالبؔ نے اپنی شاعری میں قاری کے لئے نامانوس، اجنبی تشبیہات اور استعارات، غیر مرئی اشیا کو مرئی اشیا کی حیثیت سے پیش کیا ہے وہیں نشتریت، کثیر المعانی خیالات، ایجاد وابداع، فکر و تصوف، تصورات کی ندرت، دقیق مطالب، تراکیب، مضامین، الفاظ کی بندش، معنی آفرینی، شوخی تحریر اسلوب، فلسفہ حیات۔ غرض یہ کہ غالبؔ کے بیشتر تاثرات ذاتی تجربات اور عینی مشاہدات کی بنیاد پر مبنی محسوس ہوتے ہیں جس میں صداقت کی تہہ داری پنہاں ہے، قدرتی جبر و انسان کی بے چارگی، ظریفانہ شوخی اور طنزیہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

اس بحث کا ماحصل یہ ہے کہ غالبؔ ایک ذی شعور فنکار تھے۔ ان کے اشعار کی نفسیاتی اور عملی زندگی کے علاوہ ان کی نظریاتی تھیوری کو سمجھنے میں مددگار ہیں۔ غالِب کا ایک مقبول و معروف شعر ہے:

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

اردو کے مقبول ترین شاعر اسد اللہ خاں غالبؔ کو دنیا ایک شاعر کی حیثیت سے جانتی اور مانتی ہے لیکن ان کے خطوط ان کے دور کی بہترین عکاسی کرتے ہیں جس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔ غالبؔ کی شاعری ان کی شخصیت کی پہچان ہے لیکن غالبؔ نے اپنے دوستوں، شاگردوں اور نوابوں کو بہت سے خطوط لکھے۔ یہ خطوط انھیں سمجھنے کے لیے ان کی شاعری کی ہی طرح اہم ہیں۔ ان خطوط میں خوشی ہے، شفقت ہے، بے بسی ہے، التجا ہے، تعصب ہے، پریشانیوں کا ذکر ہے، دل کی جلن ہے، آب و ہوا کا احساس ہے، شراب ہے، مرُغیوں کے انڈوں کے برابر گرنے والے اولے ہیں، بارش ہے۔ کھیت ہیں، ربیع و خریف کی فصلیں ہیں، گھر کی دیواروں کی دراڑیں ہیں، دیواروں تلے دب کر مرنے والے لوگ ہیں، انسان کے سکھ

چین پر ٹوٹ پڑنے والے لشکر ہیں' قحط ہیں، سیلاب ہیں، وبائیں ہیں، بخار ہیں، رات کی تاریکیاں ہیں، رات کی تاریکیوں میں نقب لگا کر تختے، دروازے اور چوکھٹیں نکال کر لے جانے والے چور ہیں، اس چوری سے پریشان غریب غربا ہیں، جیٹھ یعنی مئی جون کی گرمی اور گرم ہوائیں ہیں، گرمیوں کی شدت کم کرنے کے لیے خس ہے، شاعری اور ادب کے تعلق سے مباحثے ہیں، مالی تنگیوں کا رونا ہے، گندم، چنے، باجرے، بیسن اور گھی کی آسمان چھوتی قیمتیں ہیں۔قبل از وقت مرگ کا نوحہ ہے، دوستوں سے بچھڑنے کا رنج ہے، یادیں، افسردگی، اجڑے اور ویران بازار ہیں، حویلیوں کا ذکر ہے۔گزرے ہوئے ماضی اور آنے والے مستقبل کا ذکر ہے۔غالبؔ منٹو کی طوائف کی روشنی میں 'غالبؔ اردو کا پہلا جدید ذہن تھا' غالبؔ کے اشعار سے بجی کولکتہ کی گلیاں۔

غالبؔ کے خطوط کا ایک دلکش حصہ کاغذ پر بکھرے ہوئے موسم کے رنگ ہیں، یہ خطوط آب وہوا کے مرقعے ہیں، یہ اس دہلی کا منظر پیش کرتے ہیں جس کے اوپر کے آسمان اور آنکھوں کے درمیان گرد کا پردہ نہیں تھا۔

رات ہوتے ہی انجمِ رخشندہ یعنی کہکشاں اس طرح پھیل جاتی تھی جیسے کوئی روشنیوں سے جگمگاتا ہوا مندر اپنے دروازے کھول رہا ہو اور اس کی روشنی سے سارا ماحول روشنیوں میں نہا گیا ہو۔شاید اسی طرح کے کسی منظر کے تحت مرزا غالبؔ کے دل نے یہ کہا ہوگا۔

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا

ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟

پتا نہیں غالبؔ کے اس شعر کو اچھے اشعار میں شامل کیا جا سکتا ہے یا نہیں، اس لیے کہ ایک حلقہ ان کے علامتی اور استعاراتی اشعار ہی کو ان کے اچھے اشعار سمجھنے اور سمجھانے پر مصر ہے اور دوسرا حلقہ صرف بیانیہ اشعار ہی کو غالبؔ کا ''اصلی'' رنگ سمجھتا ہے۔ مجھے یہ شعر اس لیے پسند ہے کہ غالبؔ کا یہ شعر ایک روشن دماغ اور سوالیہ ذہنیت کا نمائندہ ہے۔ میری ناچیز رائے میں ہر مسئلے اور اس سے وابستہ سوالات کا حرف آغاز ''یوں ہوتا تو کیا ہوتا'' میں پنہاں ہے۔یہی وجہ ہے کہ میرے لیے غالبؔ کا یہ شعر انوکھی کشش رکھتا ہے۔میں نہ تو غالبؔ کا ماہر ہوں اور نہ ہی میں نے غالبیات کے سلسلے میں لکھی گئی ساری کتابیں اور مضامین پڑھے ہیں، ہاں چند کتابوں اور چند مضامین کا مطالعہ کیا ہے اور کلیات غالبؔ (ڈاکٹر گیان چند نسخہ عرشی کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ صحیح بھی ہے) کا مطالعہ کرنے کا شرف ضرور حاصل ہے، اس لیے میں اپنے ''پراگندہ ذہن'' کی مدد سے چند باتیں لکھنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

مجھے ہمیشہ کی طرح غالبؔ کی شخصیت کا مطالعہ ایک ایسے ڈیلیما سے دوچار کرتا ہے جس کا حل آسان نہیں ہے۔ غزل کا بنیادی موضوع حسن وعشق کی باتیں کرنا ہے۔واردات قلبی کا اظہار اس کا خاصہ ہے، ابتدائی دور کی غزلوں میں معاملات عشق، عاشق، معشوق اور رقیب کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔

میرؔ سے غالبؔ تک کے عہد میں غزل اپنی کلاسکی روایت پر قائم رہی یعنی عشقیہ کیفیات کی مختلف جہتیں بیان کی

جاتی رہیں لیکن کے بعد اس کے موضوعات تبدیل ہو گئے۔ حالؔی نے اس پر قدغن لگا اور سادگی اصلیت اور جوش کی بنیاد پر اسے حقیقی زندگی کا ترجمان بنایا اور اس سے قوم کو بیدار کرنے کے لیے انقلابی روح پھونکی جس کے بعد اس کے موضوعات تبدیل ہونے لگے۔ ذہنی وفکری تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ سیاسی وسماجی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ ۱۸۵۷ کے بعد غزل میں سیاسی وسماجی مسائل کی عکاسی کی جانے لگی۔ حتیٰ کہ غالبؔ نے عشق کو فلسفیانہ نظر سے دیکھا۔ اس کے بعد یہ روایت قائم ہو گئی جس میں تصوف و فلسفہ کو موضوع بنایا جانے لگا۔ غالبؔ کا آخری دور ہی جدید غزل کا آغاز ہے غالبؔ نے غزل کو فکر وخیال کی گہرائی عطا کی۔ اس کے بعد یہ اثر فانؔی اور اصغؔر کے یہاں دکھائی دیتا ہے، چونکہ حالؔی نے غزل کی اصلاح کے ذریعے شعرا کو جدید موضوعات سے باخبر کر دیا تھا۔ حالؔی نے شاعری کا جو اصول مرتب کیا تھا اقبالؔ نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا بلکہ اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر اس میں فکر وخیال کی نئی روح پھونکی جس میں خودی کی شناخت اور عظمت رفتہ کی یاد اور ملت اسلامیہ کی شیزہ بندی کا پیغام تھا۔ حالؔی نے جس چیز کی شکایت کی تھی اقبالؔ نے اسے پورا کر دکھایا لیکن جدید غزل کی تشکیل نو اور اس کی احیا میں فانؔی، اصغؔر، حسرتؔ اور جگرؔ کو نمایاں مقام حاصل ہوا ان لوگوں نے غزل میں داخلی کیفیات اور واردات قلبی کا اظہار کیا۔ فراقؔ اور چکبستؔ نے زندگی کے بنیادی حقائق کو بیان کیا جس میں سیاسی وسماجی مسائل کی عکاسی کی گئی تھی۔ اس کے بعد ترقی پسند تحریک کے زیر اثر غزل کو انقلاب زمانہ کا حصہ بنا دیا گیا اور اس میں انقلاب زندہ باد کے نعرے، تحریک آزادی کی گونج، سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بلند ہوتی ہوئی آواز حب الوطنی کے گیت اشتراکی نظام کی عکاسی، مارکسی نظریہ، اجتماعی مسائل، مزدوروں کی نمائندگی، عورتوں کے حقوق، نوآبادیاتی نظام کے اثرات اس میں دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس دور میں مجازؔ، جذبؔی، فیضؔ، فراقؔ، مخدومؔ محی الدین وغیرہ نے اس خیال کی کھل کر نمائندگی اور غزل کو نئے موضوعات سے روشناس کرایا۔ غالبؔ کی شخصیت جامع الصفات تھی۔ وہ ایک شاعر کی حیثیت سے معروف تو ہیں ہی، ایک نثر نگار کی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بلند ہے۔ ان کے خطوط اردو میں جدید نثر کا سنگ بنیاد ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی چند ایک کتابیں ہیں۔ شاعری میں غالبؔ نے قصیدے لکھے اور مثنویاں وغیرہ بھی لیکن جس صنف کی وجہ سے غالبؔ، غالبؔ ہیں وہ ان کی غزل ہے۔ غالبؔ کو فارسی اور اردو، دونوں زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔ انھیں اردو سے زیادہ اپنی فارسی دانی پر فخر تھا۔ انھوں نے کبھی اپنی فارسی شاعری پر ناز کرتے ہوئے اردو شاعری کو "بے رنگ من است" کہا تو کبھی اردو شاعری کو رشک فارسی قرار دیا۔ ابتدا میں وہ فارسی شاعر بیدل کی پیروی کرتے تھے۔

☆☆☆

حافظ ڈاکٹر صابر پاشاہ قادری

امام وخطیب مسجد حج ہاؤز، نامپلی، حیدرآباد

مکان نمبر 23-1-728/C، خواجہ کا چھلہ،

مغلپورہ، حیدرآباد 002 500 (تلنگانہ)

یادِ رفتگاں

مولانا محمد علی جوہر کی انگریزی صحافت

مولانا محمد علی جوہر تحریک آزادی کے جانباز سپاہی، بے باک اور نڈر صحافی تھے۔ انہوں نے پنی تحریری اور تقریری صلاحیتوں سے ملک کی آزادی کے لیے جدو جہد کی۔ اردو اور انگریزی زبان میں اخبارات جاری کیے۔ مولانا کا باضابطہ صحافتی میدان میں داخلہ ''ٹائمز آف انڈیا'' میں سلسلہ ء مضامین سے ہوا، جس میں ''موجودہ بے چینی پر چند خیالات'' کے عنوان سے مضامین لکھتے رہے۔ ٹائمز آف انڈیا ایک معیاری اخبار تھا۔ مولانا اپنے مضامین کے ذریعہ ملک کے حالات پر بے باک تجزیہ پیش کرتے اور سیاسی مسائل پر بے لاگ تبصرہ کرتے۔ مولانا کے خیالات سے لوگوں کو اتفاق ہو یا نہ ہو البتہ ان کے انگریزی اسلوب پر سب لوگ فدا تھے۔ مولانا نے بہت ہی جلد بہ حیثیت انشاء پرداز اور کالم نویس اپنی شناخت بنالی۔ نومبر ۱۹۰۷ء میں ٹائمز آف انڈیا میں شائع شدہ مولانا کے مضامین "Some thoughts on present discontentment" کے عنوان سے کتابی صورت میں بمبئی سے شائع ہوئے۔

ٹائمز آف انڈیا کے علاوہ ''ابزرور'' اور ''انڈین ریویو'' میں بھی مولانا کے مضامین شائع ہوئے۔ مولانا ہمیشہ انتہائی اہم موضوعات پر قلم اُٹھاتے اور نہایت سنجیدگی اور وضاحت کے ساتھ اپنی بات پورے وثوق اور دلائل کی روشنی میں پیش کرتے۔ مولانا محمد علی کے بارے میں مشہور انگریزی ادیب ایچ جی ویلز نے کہا تھا ''ان کا دل نپولین کا، ان کی زبان برک کی، اور ان کا قلم میکالے کا تھا''۔

مولانا مودودیؒ کہتے ہیں:

''وہ ایک غلام ملک کا باشندہ تھا لیکن دنیا کی سب سے بڑی سامراجی حکومت اس سے ڈرتی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے انگریزی دور میں کم سے کم وائسرے کی اکزیکیٹو کونسل کا ممبر تو بن ہی سکتا تھا لیکن ان مناصب عالیہ پر اس نے کبھی نگاہِ غلط انداز ڈالنا بھی گوارا نہ کیا''۔ (شخصیات، ابوالاعلی مودودی، ص ۱۱۸۹)۔

کامریڈ کا محرک: کامریڈ نکالنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعہ مسلمانوں میں قومی بیداری پیدا کی جائے اور انھیں ایک فکر پر مجتمع کیا جائے۔ مولانا کا خیال تھا کہ اس مقصد کے لیے اُردو اخبارات کافی نہیں ہیں اور جو اخبارات اس وقت انگریزی میں شائع ہو رہے تھے وہ مسلمانوں کی مکمل ترجمانی نہیں کرتے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کی آواز ایوان حکومت تک پہنچتے پہنچتے دب کر رہ جاتی۔ مولانا نے سوچا ایک انگریزی اخبار کے ذریعہ مسلمانوں کے خیالات کو ایوان حکومت اور ارباب حکومت تک بہ آسانی پہنچایا جاسکتا ہے۔

اس مقصد کے لیے مولانا نے کلکتہ سے کامریڈ جاری کیا۔ رئیس احمد جعفری کامریڈ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حاکموں، محکوموں، انگریزوں، ہندوستانیوں، سارے انگریزی داں طبقے میں اس کی دھوم مچ گئی کیونکہ وہ قوم کی خستہ حالت کی عکاسی کر رہا تھا۔ اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں، خاص طور سے تعلیم یافتہ طبقہ میں خودداری کے احساسات میں بیداری پیدا ہو اور اس سے انگریزوں کی گرفت سے نکلنے کا راستہ اختیار کریں۔ اس کے اجراء کے ساتھ ہی مقبولیت کا ڈنکا بجانا شروع ہو گیا۔ اس پرچہ کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ لارڈ ہارڈنگ وائسرائے ہفتہ بھر پرچے کو نہ چھوڑتے تھے۔ لیڈی ہارڈنگ اس کی منتظر رہتیں۔ مسٹر میک ڈانلڈ، وزیراعظم برطانیہ بالالتزام کامریڈ پڑھتے تھے، جرمنی کا ولیعہد اس کا خریدار تھا۔ سرفلیٹ وڈلسن ہندوستان سے جاتے ہوئے اپنے دوست اور لندن والوں کے لیے پرچے تحفۃً لے گئے''۔ (سیرت محمد علی۔ص ۱۹۸)

کامریڈ کا اسلوب: کامریڈ اپنے منفرد اسلوب کی بدولت بہت جلد ایک انٹرنیشنل اخبار بن گیا۔ اس کے خریدار نہ صرف ہندوستان بلکہ برطانیہ میں بھی موجود تھے۔ صرف برطانیہ میں تین سو خریدار تھے۔ کامریڈ کے دور اول کا اسٹاف لائق اور تجربہ کار تھا۔ ان کے تعاون سے کامریڈ نے بہت جلد کامیابی حاصل کر لی۔ کامریڈ میں ملک کے سیاسی، سماجی اور اسلامی موضوعات پر کھل کر بحث کی جاتی۔ عالم اسلام کے مسلمانوں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی جاتی۔ کامریڈ کا ادارتی نوٹس خود مولانا تحریر کرتے۔ ان کے غیاب میں راجہ غلام حسین لکھتے۔ راجہ غلام حسین ایک سلجھے ہوئے انگریزی کے پختہ قلم کار تھے۔ بسا اوقات ایڈیٹر اور راجہ صاحب کی تحریروں میں فرق کرنا محال ہو جاتا۔

کامریڈ میں ''گپ'' (Gup) کے عنوان سے ایک مستقل فکاہیہ کالم شائع ہوتا جس نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ اس کالم میں سماجی اور سیاسی مسائل کے مضمرات کو فکاہیہ مولانا کی صحافتی قابلیت کا ذکر کرتے ہوئے جناب محمد اسحاق صاحب رقمطراز ہیں۔

''اُن کی (مولانا محمد علی کی) صحافتی گل کاری، طرز تحریر کی انقلاب آفرینی، الفاظ و محاورات کی رفعت شان استدلال کی اصابت، زور بیاں کی اثر انگیزی، سیاسی فکر و نظر کی پختہ کاری اور طنز و مزاح کی سلامت روی کے ساتھ تلخی اور ترشی نے نہ صرف ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں ہلچل پیدا کردی۔ بلکہ مغرب کے عالی مرتبت ارباب دانش اور اہل سیاست بھی ان کو خراج تحسین پیش کرتے رہے''۔ (معارف اعظم گڑھ، ص ۳۶۲)

کامریڈ نے اپنے اسلوب بیان کی ندرت اور مضامین کی دلنشینی کے باعث بہت جلد بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی۔ درجہ ذیل سطور میں کامریڈ کے اسلوب کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

کامریڈ کا شہرہ آفاق کالم گپ (Gup) کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں آنریری مجسٹریٹ کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

"He is an apollilisis of intellectual inanity, and an official recognition of native imbecility...... His loyalty is an over mastering passion".

''ایسی عقل جو اپاہج اور بے دم ہو، اس کو دیوتا بنادیا گیا اور اس کا نام رکھ دیا گیا آنریری مجسٹریٹ یا اسے ذہنی نامردی کا سرکاری اعتراف کہیے۔ اس کی سرشت کا غالب عنصر اس کا تیز وتند جذبہ وفاداری ہے''۔

ستمبر ۱۹۱۹ء میں لندن ٹائمز نے The Choice of the turks کے نام سے ایک افتتاحیہ اداریہ شائع کیا جس میں ترکوں کو جنگ عظیم میں شرکت نہ کرنے اور مکمل غیر جانبدار رہنے کی دھمکی دی گئی۔ لندن ٹائمز کے اداریہ کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"Let the Turks be under no delusion. The stand at the parting of the ways. If they elect for war at the bidding of Germany, they will be staking their existence as a state".

''ترک کسی مغالطے میں نہ رہیں۔ (اس وقت) وہ اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں سے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ اُنھوں نے جرمنی کے کہنے پر جنگ میں کود پڑنے کا فیصلہ کیا تو ان کا یہ قدم اپنی مملکت کے وجود کو داؤ پر لگانے کے مترادف ہوگا''۔ (محمد علی، شخصیت وخدمات، نظر برنی، ص: ۲۰۸)

اس کے علاوہ ترکوں کو لالچ دی گئی کہ اگر اس نے اتحادیوں کا مطالبہ تسلیم کرلیا تو اسے مملکت عثمانیہ کی سلامتی، مالی امداد اور اسے جرمنی کے یک طرفہ معاہدوں سے نجات دلانے کی ضمانت بھی دی جائے گی۔ اس کے ساتھ یہ بھی دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے جرمنی کا ساتھ دیا تو اتحادی طاقتیں سلطنت عثمانیہ کا نام ونشان مٹادیں گے۔

لندن ٹائمس کے مضمون کی تلخی اور دھمکی آمیز لہجہ کو دیکھ کر مولانا کو شک ہوا کہ کہیں ترکی اس قدر تلخ لہجہ کو برداشت نہ کرکے برطانوی فوج کے خلاف جنگ کر نہ بیٹھے، چنانچہ ترکوں کو روکنے کے لیے بھی مولانا نے یہ مضمون لکھا۔ مولانا کا مضمون ۲۶ رستمبر ۱۹۱۴ء کو کامریڈ میں شائع ہوا۔ مولانا کے کئی دوست احباب نے اس مضمون کو شائع نہ کرنے کا مشورہ دیا اور سراسر اس کو مصلحت وقت کے منافی قرار دیا۔ لیکن مولانا کب ماننے والے تھے' ان کا طرہ امتیاز صحافت ''کلمۃ حق عند سلطان جائر'' تھا چنانچہ مولانا نے اس مضمون کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ مولانا محمد علی کہتے ہیں:

''میں جانتا ہوں میں نے موت کے وارنٹ پر دستخط کیے ہیں مگر اب میں رائے قائم کر چکا ہوں، جو ہونا تھا وہ ہو چکا، اب کچھ نہیں ہوسکتا''۔ (ہندوستانی ادب کے معمار، مولانا محمد علی جوہر، شہزاد انجم، ص: ۵۵)

مولانا نے اس مضمون میں ترکوں میں اسلام کے پہنچنے کی مکمل تاریخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس مضمون کے ذریعہ لندن ٹائمس کی دھمکیوں، جھوٹے دعوؤں،

تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے اور انگلینڈ کے خود عالم اسلام کے دوست کے طور پر سامنے لانے کی خواہش کا پردہ چاک کر کے دنیا کے سامنے رکھ دیا ہے۔

مولانا نے کامریڈ کو جس انداز سے شروع کیا آخری دور میں ان کی قوت مختلف سمتوں میں تقسیم ہونے کی وجہ سے وہ انداز باقی نہیں رہا۔ مولانا وقت کی پابندی کرنے سے بھی قاصر رہے۔ حالات نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا۔ نتیجتاً ۲۲/جنوری ۱۹۲۶ء کا شمارہ کامریڈ کے لیے آخری ثابت ہوا اور کامریڈ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

مولانا کامریڈ کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے صدق دل سے کوشاں رہے۔ وہ ہندوستان کو انگریزوں کے تسلط سے نکالنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو عظمت رفتہ کی یاد دلا کر ان کو بیدار کرنا اور اقوام عالم میں انھیں ایک باعزت مقام دلانا چاہتے تھے۔ مولانا کا قول ہے ''میں نے ہمیشہ اتحاد کی حمایت کی اور میرے اخبار کا نام کامریڈ اسی پر دلالت کرتا ہے''۔

مولانا اپنی ہنگامہ خیز سیاسی مصروفیتوں کی وجہ سے آخر میں کامریڈ کے لیے زیادہ وقت نکال نہ سکے جس کی وجہ سے کامریڈ کا دور ثانی پہلے دور کی طرح روشن نہیں رہا۔ احمد سعید ملیح آبادنے بالکل صحیح لکھا ہے:

''کامریڈ دنیائے صحافت میں ایک دھماکہ بن کر نمودار ہوا اور اس شان سے نکلا کہ انٹرنیشنل اخبار بن گیا اور جب تک نکلا، اپنے قدردانوں میں خوب مقبول رہا۔ اگر چہ دور ثانی ۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۶ء میں حالت یہ ہو گئی تھی کہ کامریڈ نام کو تو ہفتہ وار تھا مگر مہینے میں کہیں ایک آدھا ایشو جیسے تیسے نکل جاتا جس میں مولانا محمد علی کی زندگی کے آخری دور کی بے ترتیبی، بدنظمی اور انتشارِ ذہن کو دخل تھا''۔ (اردو معلیٰ غالب نمبر ۳۱۸)

کامریڈ کا بے باک لہجہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس دور میں جبکہ دوسرے اخبار انگریز حکومت کی مدح سرائی میں مصروف تھے' کامریڈ نے حکومت کی پالیسیوں کی کھل کر مخالفت کی اور انگریزی زبان کا جو رعب و دبدبہ اور نفسیاتی دباؤ ہندوستانیوں پر چھایا ہوا تھا اس کو مولانا نے کامریڈ کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کے خیالات کو حکومت وقت تک پہنچانے کے لیے کامریڈ نے اہم رول ادا کیا ورنہ ان کی آواز کو دبایا اور کچلا جا رہا تھا۔ مسجد کانپور کے مسئلہ میں مولانا محمد علی نے کامریڈ کے ذریعہ حالات کی صحیح عکاسی کی۔ کامریڈ نے خبروں کی صحت کے معیار کو قائم رکھا، بے ہودہ اشتہارات اور بغیر تصدیق کے خبروں کی اشاعت سے اپنے آپ کو باز رکھا۔ کامریڈ ایک غیر جانبدار اخبار تھا، بے جا کسی کی طرف داری کو اس نے اپنا شعار نہیں بنایا۔

غرض مولانا نے جن مقاصد کے تحت کامریڈ اخبار نکالا اُن میں مولانا پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر شیخ فاروق باشا
اسسٹنٹ پروفیسر
گورنمنٹ ڈگری کالج، رائے چوٹی' آندھرا پردیش

یاد رفتگاں

ڈاکٹر زورؔ کی مقدمہ نگاری

مشرقِ وسطیٰ اور وسط ایشیا کے ملکوں کی طرح ہندستان میں بھی صوفی خانقاہیں قائم تھیں ۔ انہی خانقاہی نظام کے حضرت سانگڑے سلطانؒ سے ہوتے ہوئے حضرت زعمؒ کی اولاد میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، جو اپنی ذات میں ایک اِدارہ تھے اور اپنے علمی و اَدبی کارناموں کی بنا اَدبی دنیا میں ایک بڑے اسکالر مانے جاتے ہیں ۔ اُردو اَدب کے اِس اعلیٰ پایہ سپوت نے نہ صرف دکنی زبان و اَدب کی حفاظت کے لیے بہترین سعی کی بلکہ اپنے رفقا و شاگردوں کے ساتھ ایک کاروانِ اَدب کو اپنے ہم راہ لیے ہر طرح سے اُردو اَدب کی بقاء اور ترویج و ترقی کا سلسلہ شروع کیا ۔

ڈاکٹر زورؔ بیک وقت اَدیب ، نقاد ، محقق ، ماہر لسانیات ، ماہر دکنیات ، مورخ ، مدون اور شاعر تھے ۔ یہی وہ خوبی تھی کہ اَدب کی تقریباً سبھی اَصناف پر اپنی تحریریں ثبت کی ہیں جن میں سے ایک اُن کے لکھے ہوئے مقدمے بھی ہیں ۔ جس میں ڈاکٹر زورؔ کی تحریر کا اپنا ایک مخصوص اَنداز اور طرز بیان ہے ، ''اِفاداتِ زورؔ'' میں شامل مقدمات کی روشنی میں چند اَقتباسات کے ساتھ یہ مضمون رقم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن کی اپنی ایک ندرت ہے ۔ ڈاکٹر زورؔ نے نہ صرف بڑے اُدبا و شعرا اور اپنے ساتھیوں کی تصنیفات پر مقدمے لکھے ہیں بلکہ نئے لکھنے والے اور اپنے شاگردوں کی تحریر کردہ تصانیف پر بھی مقدمات لکھتے ہوئے اُن کی بھرپور ہمت افزائی بھی کی ہے ۔

ایک زمانہ تھا آر ۔ ایچ ۔ پول نے اپنی انگریزی شگفتہ تحریروں کی وجہ سے کافی مقبولیت پائی تھی جس کے انگریزی ناول ''ہزمیک بلیو وائف'' کا اُردو زبان میں ترجمہ کی ہوئی عباس حسین لطفی کی کتاب ''مصنوعی بیوی'' کے مقدمہ میں ڈاکٹر زورؔ یوں رقم طراز ہیں :

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ نونہال اُس مقصد کے حصول کی طرف نہایت مستعدی کے ساتھ متوجہ ہوگئے ہیں ، جو اس جامعہ کا بنیادی عنصر ہے ۔'' (حوالہ مشمولہ ''اِفاداتِ زورؔ''، جلد اوّل ، ص: ۱۰۳)

ڈاکٹر زورؔ نے اپنی پہلی یورپ کی روانگی سے قبل اگست ۱۹۲۷ء میں یہ مقدمہ لکھا تھا ، اس طرح ڈاکٹر زورؔ کا یہ پہلا مقدمہ بھی ہے ، جو بی ۔ اے (سالِ آخر) کے طالبِ علم کی کوششوں اور اِس ذوقِ اَدب کو جاری رکھنے کے لیے کس طرح سراہتے ہیں ملاحظہ فرمائیں :

''تخلیقی اَدب کا صحیح اور دلچسپ ترجمہ کرنا ایک معمولی اور آسان کام نہیں ۔ لطفی صاحب نے اِس دشوار گذار منزل میں جس کامیابی کے ساتھ گامزنی کی ہے، اس کا اَندازہ اُن کے ترجمہ کے مطالعے کے بعد ناظرین کر سکتے ہیں ۔ لیکن ہم یہاں لایق مترجم کو اُن کے ترجمہ کی خوبی ، دلکشی اور صحت پر مبارکباد دیے بغیر نہیں رہ سکتے ۔'' (حوالہ مشمولہ ''اِفاداتِ زورؔ''، جلد اوّل، ص: ۱۰۳)

پریم چند اُردو کے پہلے اَدیب ہیں ، جنھوں نے اعلیٰ یا علمی طبقہ کو مخاطب کرنے کی جگہ عوام سے سروکار رکھا، اور اپنی ساری عمر ہندستانی اَدب اور اُردو زبان کی بے لوث خدمت میں گذاری ۔ پریم چند اُردو زبان کے اُن چند معدودے محسنوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی کوششوں کے ذریعہ اُردو زبان کو دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبان کے پہلو بہ پہلو کھڑا کر دیا۔ اِن کی تحریروں میں کسی بھی قسم کا تصنع اور بناوٹ نہیں ، جنھوں نے ایک ایسے اَدب کا اِضافہ کیا جو اِس زبان کے بولنے والوں کی زندگی اور معاشرت کا سچا آئینہ دار ہے ۔ مولوی حسام الدین غوری کی مرتبہ کتاب ''پریم سوگ'' کے مقدمہ میں ڈاکٹر زورؔ لکھتے ہیں:

''پریم چند سے پہلے کسی اُردو اَدیب نے عوام کی زندگی اور دیہات کی معاشرت کا نقشہ اس خوبی اور بے تکلفی سے نہیں کھینچا تھا۔ مسائلِ حاضرہ اور ضروریاتِ زمانہ سے وہ اچھی طرح باخبر تھے اور اُن کے افسانے اور ناول انہی جدید رُجحانات کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے مانگے تانگے کے مسالے سے کام نہیں لیتے ۔ انشاء پردازانہ قوت اور عبارت آرائی کے اِظہار سے زیادہ غریبوں اور امیروں، مزدوروں اور سرمایہ داروں، عورتوں اور مردوں کی اصلی زندگی کے ایسے نمونوں اور ان کے متضاد کردار کے ایسے پہلوؤں پر زور دیتے ہیں جن کا مطالعہ ہر طبقہ اور ہر استعداد کے پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتا ہے ۔'' (حوالہ مشمولہ ''اِفاداتِ زورؔ''، جلد اوّل، ص: ۱۰۴)

پریم چند کی زندگی محبت ، خلوصِ عمل اور سادگی سے معمور تھی اور اُن کی جملہ تحریروں میں بھی یہی خصوصیات ہمیں ملتی ہیں وہ تعصب سے پاک تھے ۔ اِن سے بڑھ کر کامیاب اَدبی زندگی اُس عہد کے کسی اور اَدیب کو شاید ہی نصیب ہوئی ہو ۔ اِس بارے میں ڈاکٹر زورؔ اس طرح رقم طراز ہیں:

''جس شخص میں محبت کا عنصر اِتنا زیادہ ہو کہ اپنا اصل نام چھوڑ کر پریم چند نام رکھ لے تو اُس کے دل میں کینہ و حسد کے جذبات کیوں کر راہ پا سکتے ہیں ۔'' (حوالہ مشمولہ ''اِفاداتِ زورؔ''، جلد اوّل ، ص: ۱۰۵)

نئے لکھنے والے محمد حسام الدین خاں غوری کی

یادِ رفتگاں

کوششوں پر کس قدر ہمت افزائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

''محمد حسام الدین خاں غوری نے بڑا اچھا کیا کہ اُن (پریم چند) کے حالاتِ زندگی اور خصوصیاتِ تحریر کے متعلق یہ مختصر سی کتاب مرتب کردی۔ یہ ایک تعارفی کوشش ہے اور منشی پریم چند کے مکمل سوانح حیات کا پیش خیمہ سمجھی جاسکتی ہے۔ کیوں کہ یہ یقینی ہے کہ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں اِس محسنِ اَدب کی نسبت آئندہ طویل سے طویل کتابیں ضرور لکھی جائیں گی۔ توقع ہے کہ یہ مخلصانہ کوشش ضرور قبول ہوگی۔'' (حوالہ مشمولہ ''اِفاداتِ زورؔ''، جلد اوّل، ص:۱۰۶)

مولوی نصیرالدین ہاشمی اُن باہمت نظر بازوں میں ایک مخصوص حیثیت کی حامل شخصیت جو ڈاکٹر زورؔ کے رُفقائے خاص میں شامل تھے۔ اُن کی کتاب ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' کے لیے اُنھوں نے یورپ جاکر دکنی مخطوطات پر کام کیا۔ نصیرالدین ہاشمی اپنے خاندان کے قابلِ تقلید بزرگوں کی طرح تاریخِ دکن سے خاص انہاک رکھتے تھے، اُن کی کتاب ''دکن میں اُردو'' بھی اپنی قسم کی پہلی کتاب ہے۔

نصیرالدین ہاشمی کی کتاب ''یورپ میں دکنی مخطوطات'' کا موضوع کئی وجوہ سے اہم ہے۔ اس کتاب میں جن مخطوطات اور مصنفوں کی نسبت معلومات پیش کی گئی ہیں وہ اُردو زبان کے قدیم ترین کارنامے اور اَساتذہ ہیں۔ اِس ضخیم کتاب میں صرف یورپ کے مخطوطات کا ذکر ہے۔ سرزمین دکن میں لکھی ہوئی وہ سینکڑوں بیش بہا کتابیں اِس میں درج نہیں ہیں جو ہندستان میں موجود ہیں۔ اس کتاب کے مقدمہ میں ڈاکٹر زورؔ جس اَنداز و سلیقے سے اِس کمی کو پُر کرنے کی طرف اِشارہ کیا ہے، ایک نظر آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

''کیا ہی اچھا ہو، اگر انجمن ترقی اُردو، نواب سالار جنگ، آغا حیدر حسن اور حیدرآباد کے دوسرے امیروں اور عالموں کے کتب خانوں میں جو نایاب ذخیرے محفوظ ہیں، اُن کے تذکرے بھی اسی تفصیل اور تحقیق کے ساتھ شائع ہوجائیں۔ اور اُردو اَدب کی تاریخ کی تکمیل میں آسانی ہو۔'' (حوالہ مشمولہ ''اِفاداتِ زورؔ''، جلد اوّل، ص:۱۵۰)

نواب عزیز یار جنگ بہادر اُستاد الاساتذہ نواب مرزا داغؔ دہلوی کے تلامذہ میں سے تھے۔ ذوقِ سخن اور پختہ مشقی کی وجہ سے اپنے عہد کے اَساتذہ فن میں شمار کیے جاتے تھے۔ دولت وثروت اور عمر وتجربے کی بناء پر اِس درجہ پر پہنچ چکے تھے کہ کسی سے رشک وحسد یا مقابلہ کا خیال اُن کے لیے کسرِ شان تھا۔ وہ دبستانِ داغؔ کے ایسے مستحکم پیرو تھے کہ زبان کی ذراسی لغزش یا آزادروی کو قطعاً پسند نہیں کرتے۔ زبان کے تقدس اور اہمیت کا اِتنا ہی لحاظ رکھتے جتنا قدیم شعرا میں ذوقؔ وغالبؔ، آتشؔ وناسخؔ اور داغؔ وامیرؔ نے اپنی کاوشوں سے سنوارا اور اِس کے معیار کو

ایک بلند درجے پر پہنچایا۔نواب عزیز یار جنگ کے شعری مجموعہ ''نقدِ سخن'' پر مقدمہ لکھتے ہوئے نوخیز شعراء کی رہنمائی اور اِس بات کی تقلید کے لیے کہتے ہیں:

''نقدِ سخن'' کی یہی وہ تاریخی اور فنی اَہمیت ہے جس کی بناء پر اِدارہ ءِ اَدبیاتِ اُردو کے مدیرِ عمومی نے نواب عزیز سے اِستدعا کی تا کہ اس کو اِدارہ کی طرف سے شائع کرنے کی اِجازت دی جائے۔اس کی اشاعت سے نوجوان شاعروں کو معلوم ہوگا کہ زبان ومحاورہ کا خیال کس حد تک ضروری ہے اور زبان کے قواعد اور اُصولوں کی پابندی اَساتذہ ءِفن کی نظر میں کیا اہمیت رکھتی ہے۔اس کا مقصد محض باقیاتِ فانی پر تنقید ہی نہیں ہے بلکہ اس کو دوسرے نوخیز شعرا کو بے راہ روی سے باز رکھنے کی ایک مخلصانہ کوشش سمجھنا چاہیے۔'' (حوالہ مشمولہ ''اِفاداتِ زورؔ''، جلداوّل،ص:۱۶۶)

شاعری کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ اُردو زبان شاعروں کی بھی مرہونِ منت ہے شاعروں کی خدمات عالموں اور فاضلوں کے بڑے سے بڑے کارناموں سے زیادہ مفید ثابت ہوئی ہے۔اس بارے میں ڈاکٹر زورؔ کہتے ہیں:

''کسی زبان کے بنانے اور بگاڑنے والے زیادہ تر شاعر ہی ہوتے ہیں۔خاص کر اُردو زبان تو اِبتداء ہی سے شاعروں کی مرحونِ منت رہی ہے۔اِس کو مقبولِ عام بنانے میں جتنی خدمت کی ہے، بادشاہوں کے درباروں اور عالموں اور فاضلوں کی مجلسوں نے نہیں کی۔ مشاعرہ ہی ایک ایسا مشترکہ پلیٹ فارم ثابت ہوا ہے جس پر صدیوں سے ہندو، مسلمان، اُردوداں اور غیر اُردوداں سب بلاتفریق مذہب وملت برابر کا حصہ لیتے آئے ہیں۔ اس میں نہ ذات پات کا اِمتیاز ہے نہ اَمیر غریب کا۔'' (حوالہ مشمولہ ''اِفاداتِ زورؔ''، جلداوّل،ص:۱۶۴)

آخر میں ایک اور مقدمہ کا اقتباس پیش ہے، جو اِدارہٗ اَدبیاتِ اُردو کے بہت پرانے رفیق اور کارکن پروفیسر محمد بن عمر نے اپنی تعلیمی مصروفیات اور جامعہ عثمانیہ میں تدریسی کام انجام دیتے ہوئے ،گلبرگہ شہر میں اِدارے کا اِمتحانی مرکز قائم کیا اور پندرہ سال تک وہاں ہر عمر کے بچوں اور بڑوں میں اُردو زبان واَدب کا اچھا ذوق پیدا کیا۔جن کی تحقیقی کتاب ''کلیاتِ غواصیؔ'' کے مقدمہ سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''جب محمد بن عمر مرحوم کی زیرِ ترتیب کتابوں اور کاغذات کا صندوق اُن کے کپڑوں اور دوسرے سامان کے ساتھ ترکی سے حیدرآباد آیا تو اُن کے بھائی مولوی علی بن عمر اور مرحوم کی غمزدہ بیوہ نے ''کلیاتِ غواصیؔ'' کا مسودہ اِدارے کے سپرد کر دیا کہ اِس کو شائع کرے یا اپنے کتب خانہ میں محفوظ رکھے۔اِس مسودہ کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مرحوم نے اس کی ترتیب میں بڑی زحمت اُٹھائی تھی۔'' (حوالہ مشمولہ ''اِفاداتِ زورؔ''، جلد اوّل، ص:۲۰۲)

اِسی مقدمہ میں آگے لکھتے ہیں کہ:

''پروفیسر محمد بن عمر نے اِس کلیات کا جو مقدمہ تحریر کیا تھا وہ بھی ایک ناقص شکل میں دستیاب ہوا ہے۔ چوں کہ وہ پی ایچ۔ ڈی کے لیے مقالہ لکھ رہے تھے، اس لیے اس میں قطب شاہی دور اور غواصیؔ کے ہمعصروں پر بڑی تحقیقی تفصیلات درج ہیں۔ خود غواصیؔ کے بارے میں اور اِس کلیات کی نسبت اُن کا لکھا ہوا مسودہ دستیاب نہیں ہوا۔ اِس لیے میں نے اُس شاعر کے کچھ حالات بہ طور مقدمہ شریک کروائے ہیں اور آخر میں مرحوم محمد بن عمر کے مقالے کے چند اجزاء بھی شامل کیے ہیں تا کہ معلوم ہو وہ کس عمدہ طریقے پر اس کی تکمیل کر رہے تھے۔''

(حوالہ مشمولہ ''اِفاداتِ زورؔ''، جلد اوّل، ص: ۲۰۳)

اس مضمون میں ڈاکٹر زورؔ کے لکھے ہوئے چند مقدمات سے لیے گئے اَقتباسات کو پڑھنے سے خاص طور پر اَدب کے قاری، طالبِ علم اور ریسرچ اِسکالرس کو اِن مقدماتِ زورؔ کی اہمیت و اِفادیت کا اَندازہ ہوگا اور اُمید کہ ڈاکٹر زورؔ کے لکھے ہوئے مقدموں کی روشنی میں آگے لکھنے والوں کو ایک طریقے وسلیقے کی راہ میسر ہوگی۔

••◆••

ڈاکٹر جعفر جری
پرنسپل، یونیورسٹی کالج آف آرٹس اینڈ سوشیل سائنسس، ساتا واہنا یونیورسٹی، کریم نگر۔
505002 (تلنگانہ اِسٹیٹ) اِنڈیا۔

دور اندیشی

ایک بوڑھے میاں ہانپتے ہوئے زرگر (سنار) کے پاس گئے اور کہنے لگے بیٹا مجھے تھوڑی دیر کیلئے سونا تولنے والی ترازو دیدو مجھے سونے کا برادہ تولنا ہے۔ زرگر نے جواب میں کہا ''بڑے میاں معافی چاہتا ہوں میرے پاس چھلنی نہیں ہے''۔ بڑے میاں نے حیرت سے کہا ''ارے بیٹا مجھ بوڑھے سے مذاق کرتا ہے میں ترازو مانگ رہا ہوں اور تو کہتا ہے میرے پاس چھلنی نہیں ہے''۔ سنار نے کہا ''قبلہ میں سچ کہہ رہا ہوں میری دکان میں جھاڑو بھی نہیں ہے''۔ بڑے میاں کو غصہ آیا اور کہنے لگے ''تجھے خدا کا خوف نہیں تو کیسی باتیں کر رہا ہے' یا تو تو بہرا ہے یا میری بات کو سمجھ نہیں رہا''۔۔۔ سنار نے کہا ''جناب میں بہرا نہیں ہوں میں آپ کی باتیں سن رہا ہوں اور نہ ہی دیوانہ ہوں کہ آپ زمین کی پوچھیں اور میں آسمان کی کہوں۔ آپ شاید حقیقت پر غور نہیں کر رہے۔ میں آپ کی حالت دیکھ کر انجام پر غور کر رہا ہوں کہ آپ کے ہاتھوں میں رعشہ ہے اور نظر بھی کمزور ہے اور اس عمر میں وہم کی بیماری بھی ہوجاتی ہے۔ آپ کے پاس سونے کی ٹھوس ڈلی تو ہے نہیں کہ جس کا آپ نے وزن کرنا ہے۔ آپ کے پاس جو سونا ہے وہ برادے کی شکل میں ہے۔ ظاہر ہے جب آپ اس برادے کو تولنے لگیں تو ہاتھ میں رعشہ کی وجہ سے اس کے ذرّات زمین پر گر پڑیں گے' پھر انہیں اکھٹا کرنے کے لئے آپ کو جھاڑو کی ضرورت پڑے گی' جب آپ جھاڑو سے مٹی اکٹھی کرلیں گے تو لامحالہ آپ کو چھلنی کی بھی ضرورت پڑے گی' میں نے پہلے ہی آپ کا انجام دیکھ لیا ہے اس لئے میں آپ کو ترازو نہیں دے سکتا''۔ اس حکایت میں ہمیں یہ درس حیات ملتا ہے کہ جو شخص صرف آغاز پر نظر رکھتا ہے وہ بصارت سے محروم ہے اور جو انجام پر نگاہ رکھتا ہے وہ دور اندیش اور عقلمند ہے' وہ کبھی شرمسار نہیں ہوتا۔ (حکایات رومی: نمبر 72' ص: 241/42)

اردو فنگار

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

یادِ رفتگاں

بقول پروفیسر عنوان چشتی "دنیا میں اشخاص بہت ہیں شخصیتیں کم ہیں" پھر شخصیتوں میں بھی کثیر الجہت شخصیتیں خال خال ہی ہوتی ہیں، شخص کے شخصیت بننے کا عمل درحقیقت قطرہ کے گہر بننے کا عمل ہے جو اہل نظر سے مخفی نہیں مگر "دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک"، مسلم ہے، غرض شخص کا دائرہ کار نہایت محدود اور کم ہوتا ہے جبکہ شخصیت کا دائرہ فکر وعمل غیر محدود اور بہت زیادہ ہوتا ہے جو سماج کے ہر طبقہ کو ممتاز کرتا ہے اور ہمہ جہت خدمات انجام دیتا ہے۔ اردو اور اہل دکن کے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ انہیں اردو کا وہ مجاہد اور متوالا نصیب ہوا جو صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے اور بڑی مشکل سے چمن میں ایسے دیدہ ور پیدا ہوتے ہیں جن کا کاز اور کار طلسم شب کو توڑنا اور جمود کے سحر کو ختم کرنا اور گراں قدر کارہائے نمایاں انجام دے کر تا آخر دم زیست اپنے مشن کی تکمیل اور اپنے نصب العین کو برقرار رکھنا اور زندگی کا حق ادا کرنا ہوتا ہے، خوش نصیبی سے ڈاکٹر زور کا شمار بھی ایسی ہی عدیم المثال شخصیات میں ہوتا ہے۔

نام اور مختصر خاندانی تعارف: حیدرآباد کے ایک معزز اور سادات گھرانے میں ڈاکٹر زور ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۲۲ھ کو حیدرآباد کے محلہ شاہ گنج میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب ان کے جد اعلیٰ سید شاہ سانگڑے سلطان کے واسطے سے حضرت قطب الاقطاب سید احمد رفاعیؒ سے جاملتا ہے۔ خود ڈاکٹر زور کے والد حضرت سید غلام محمد زعمؔ بھی ایک متبحر عالم وفاضل اور واعظ وشاعر گزرے ہیں، اسی طرح ڈاکٹر زور کی والدہ محترمہ کا نام بشیر النساء بیگم تھا، ان کے نانا بھی اپنے وقت کے ایک بڑے عالم اور صاحب تصنیف تھے۔

تعلیمی مراحل: فضیلت جنگ حضرت مولوی انوار اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ڈاکٹر زور کی تسمیہ خوانی کی، چار سال کی عمر میں انہیں کایستھ پاٹھ شالہ بارہ گلی میں شریک کیا گیا، پھر مدرسہ مفید الانام میں زیر تعلیم رہ کر مڈل کا امتحان پاس کیا، بعد ازاں دانشگاہ علوم ومعارف جامعہ نظامیہ میں مولوی کے نصاب کی تکمیل کی اور گوپال رتنم کے کوچنگ اسکول میں خانگی طور پر میٹرک کے امتحان کی تیاری کی اور ۱۹۲۱ء میں میٹرک کامیاب کیا۔ اس طرح بی۔اے کی تکمیل کے بعد ایم۔اے کا امتحان دے کر امتیازی نشانات سے کامیابی حاصل کی، پھر جب نواب رفعت یار جنگ اور سر نظامت جنگ سے قربت بڑھی تو زور صاحب کی تعلیمی جستجو سے متاثر ہو کر انہوں نے حکومت سے اعلیٰ تعلیم کے لئے وظیفہ کو منظور کرایا، جس کے نتیجہ میں ۱۹۲۷ء میں یورپ گئے پھر لندن یونیورسٹی سے استحقاق کے بعد پی ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لئے اردو زبان کے آغاز وارتقاء کے موضوع پر مقالہ لکھا پھر برٹش میوزیم کے کتب خانے اور انڈیا آفس لائبریری سے استفادہ کرکے تحقیق کے معرکے سر کئے۔ ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد لوٹنے کے بعد تین ماہ اس مواد کے حسن ترتیب میں صرف کئے اور اردو شہ پارے کے نام سے کتاب شائع کرکے دوبارہ لندن روانہ ہوگئے اور وہاں اسکول آف اورینٹل اسٹیڈیز اور یونی ورسٹی کالج آف لندن میں لسانیات کی اہمیت کے پیش نظر صوتیات کی تعلیم حاصل کی، انہوں نے پروفیسر ٹرنر سے سنسکرت اور لسانیات کا

درس لیا جبکہ یونی ورسٹی کالج آف لندن کے پروفیسر اور صدر شعبۂ لسانیات پروفیسر لائیڈ جیمس سے صوتیات کی تعلیم حاصل کی۔ یہ دونوں پروفیسر صاحبان ڈاکٹر زورؔ کو ان کے حصول علم کی تڑپ کے باعث بہت عزیز رکھتے اور ان کی قدر کرتے تھے۔

ملازمت: ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر زورؔ کی یورپ سے واپسی کے بعد ان کی علمی قابلیت کی بنا پر جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو میں بحیثیت ریڈران کا تقرر عمل میں آیا، اس وقت بابائے اردو مولوی عبدالحق صدر شعبہ تھے، مولوی عبدالحق اور سید سجاد صاحب کی وظیفہ پر سبکدوشی کے بعد ڈاکٹر زورؔ پروفیسر بنے اور ۱۹۴۸ء تک صدارت ہی پر فائز رہے۔ اسی طرح وہ صدر شعبۂ اردو و فارسی کے ساتھ ڈین فیکلٹی آف آرٹس اینڈ اورینٹل لینگویجس بھی مقرر ہوئے، بعد ازاں ۱۹۴۸ء دارالعلوم کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے چادرگھاٹ کالج کی پرنسپلی پر ڈاکٹر زورؔ کا تبادلہ کردیا گیا، دس سال اس کے پرنسپل رہنے کے بعد ۱۷ر ڈسمبر ۱۹۶۰ء میں وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ چند ماہ بعد ریاست کشمیر کے وزیر اعلیٰ بخشی غلام کی خواہش پر انہوں نے کشمیر یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کی صدارت قبول کی اور ۱۰ سال اس پر فائز رہے، چونکہ اردو زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت دی گئی تھی اس لئے اردو کام کے مواقع بہت تھے، ڈاکٹر زورؔ نے اردو کے طلبہ اور اساتذہ کو تحقیق کی طرف مائل کیا اور ان کی خوب ذہن سازی کی۔

اردو کے فروغ کے لئے ڈاکٹر زور کے نمایاں کارنامے: اس مقالے میں جامعہ نظامیہ کی نسبت سے بہت سی نامی گرامی قابل ذکر شخصیات کا نام اور کام اہم ہے اور اس مقالہ میں شامل ہے تاہم اگر اردو ادب کے انسائیکلو پیڈیا ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کا ایک ہی نام اردو ادب اور تحقیق کے فروغ میں ان کی خدمات ہی کافی تھیں۔ غرض ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت ایک ہشت پہلو نگینہ کی سی ہے جس کے ہر پہلو کی تب و تاب اور آب اپنی جداگانہ چمک رکھتی ہے اور ڈاکٹر زورؔ کی ہمہ پہلو صفات شخصیت کا ہر پہلو ایک علاحدہ دفتر یا کتاب کا متقاضی ہے۔ ان کی ادبی جہات میں تاریخ، تحقیق، تنقید، نظامت، لسانیات، دکنی خدمات، ترتیب و تدوین، مخطوطہ شناسی، دیباچہ نگاری، افسانہ نگاری، فارسی خدمات، شاعری اور مکتوب نگاری وغیرہ پہلو شامل ہیں۔ ہر پہلو کے لئے جداگانہ دفتر درکار ہے تاہم یہاں ان پہلوؤں پر مختصراً روشنی ڈالی جاتی ہے تاکہ اردو ادب کے تئیں ان کی خدمات کی ایک جھلک سامنے آجائے۔

تحقیق: یوں تو ڈاکٹر زورؔ اردو ادب کے ہر پہلو پر گہری نظر رکھتے تھے مگر تحقیق ان کا خاص میدان ہے اور خود ڈاکٹر زور بھی اس کے لئے نہایت اہل اور موزوں تھے اور وہ ''ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند'' کے مصداق تھے، اردو کی چار سوالہ ادبی اور لسانی روایات کے بکھرے سلاسل کو انہوں نے گولکنڈہ کی تہذیبی تاریخ اور دکنی مخطوط پر کام کر کے ملادیا ہے، اردو شہہ پارے، حیات اور قلی، حیات میر محمد مومن، دکنی ادب کی تاریخ، کلیات محمد قلی کی تدوین، داستانِ ادب حیدرآباد، حیدرآباد فرخندہ بنیاد اور دکنی مخطوطات کی توضیحاتی فہرستوں کی ترتیب اس تحقیقی کام کی نمایاں مثالیں ہیں، علاوہ ازیں انہوں نے گولکنڈہ کے ہیرے اور سیر گولکنڈہ جیسی کتابیں لکھ کر دکنی تہذیب و تاریخ کو استحکام بخشنے میں اہم رول ادا کیا، وہ بلاشبہ تحقیق کے مرد آہن تھے اور اس کے لئے درکار خوبیوں کے جامع تھے، لسانیات اور صوتیات پر ان کی

اردو فتگاں

گرفت نہایت مضبوط تھی۔ انگلینڈ اور فرانس میں انہوں نے ان تمام علوم وفنون کی مہارت حاصل کی تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ مخطوطہ پڑھنے، کاغذ پہچاننے، نستعلیق، نسخ اور کوفی کے علاوہ خط ثلث کے پڑھنے میں ماہر تھے، اردو شہہ پارے حیات میر محمد مومن، مرقع سخن اور کلیات محمد قلی کی ترتیب وتدوین اور اس کی اشاعت کر کے انہوں نے دکن میں اردو ادب پر احسان عظیم کیا ہے۔

افسانہ نگاری: ڈاکٹر زورؔ کثیر الجہت ادیب وشاعر تھے چنانچہ وہ ایک بہترین افسانہ نگار بھی تھے اور اس کے ثبوت کے لئے ان کے افسانے سیر گولکنڈہ، طلسم تقدیر، تازیانہ، اور گولکنڈہ کے ہیرے، لائق مطالعہ اور قابل دید ہیں جس سے ان کی افسانہ نگاری کے جوہر وگوہر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ طلسم تقدیر کے افسانوں میں تخیل زیادہ ہے اور تاریخ کم جبکہ سیر گولکنڈہ اور گولکنڈہ کے ہیرے میں تاریخی عناصر زیادہ ہیں۔ جن کے ماخذ بقول زورؔ یہ ہے گولکنڈہ کے ان نیم تاریخی افسانوں کا مواد قدیم تاریخوں، یوروپی سیاحوں کے سفر ناموں، یادداشتوں اور گولکنڈہ اور بیجاپور میں لکھی ہوئی اردو کتابوں کے علاوہ ان روایات سے بھی حاصل کیا گیا ہے جو اس ملک کے عہد حاضر کے باشندوں تک سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی آرہی ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ کی افسانہ نگاری پر مضمون لکھتے ہوئے ڈاکٹر گیان چند جین نے یوں لکھا ''اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کو ان مختصر افسانوں کا مواد بہم پہونچانے میں کتنی تحقیق کرنی پڑی ہوگی، سیر گولکنڈہ کے افسانوں کی بنیاد مضبوط تاریخی بنیادوں پر ہے، جس طرح سنگھاسن بتیسی میں راجہ بکرماجیت کے گن گائے گئے ہیں اسی طرح مصنف نے ان افسانوں میں قطب شاہی بادشاہوں کو مثال بنا کر پیش کیا ہے، طویل دیباچے میں قطب شاہی خاندان کے بادشاہوں کی خوبیاں بیان کی ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ کے تیسرے افسانے ''گولکنڈہ کے ہیرے'' کا پہلا افسانہ ''بالا'' ہے۔ جس میں گولکنڈہ کی ایک حسین ہندو رقاصہ کی ذہانت وفطانت اور فہم وفراست کی بڑی دلچسپ باتیں ہیں، شہزادہ کام بخش خداداد محل کے ایک دالان میں ٹہل رہا ہے، محل کی ویرانی اور شہزادے کے اضطراب کا مرقع ملاحظہ ہو جس سے ڈاکٹر زورؔ کی نثر نگاری اور داستان نگاری کے حسن بیان کا اظہار ہوتا ہے:

''اس عظیم الشان محفل کا گوشہ گوشہ اپنی عظمت گزشتہ پر نوحہ خوانی کرتا نظر آرہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک نئی نویلی اور آراستہ وپیراستہ دلہن یکا یک بیوہ ہوگئی ہے اور اس کا تمام سنگھار اس کے سہاگ کے ساتھ ختم ہوگیا ہے، لیکن اس تباہی کے باوجود اس کے نوعروسی کے آثار باقی ہیں۔

کام بخش کے مضطرب دل کو اس ستم زدہ ماحول اور اجڑے دیار کا چپہ ہر گھڑی ایک نئی ٹھیس لگاتا تھا، جب کبھی کسی دروازہ یا کھڑکی کے اکھڑے ہوئے زریں یا ہاتھی دانت کے نقش ونگار یا چھتوں، محرابوں اور دیواروں کے طلاکار حاشیوں کے باقی ماندہ آثار پر اس کی نظر پڑتی تو اس کی وحشت میں اور اضافہ ہوجاتا۔ وہ کبھی اپنے فتح مند باپ کی ظالم فوجوں اور اس کے متعین کردہ صوبہ داروں کی ان تباہ کاریوں پر افسوس کرتا اور کبھی قطب شاہی حکمرانوں کے ذوق لطیف اور سلیقۂ زندگی کی بے تحاشہ تعریف اس کے منہ سے نکل پڑتی''۔

اس کا پانچواں افسانہ ''دفینہ'' ہے جو ایک خاص رومانی

یادرفتگاں

قصہ ہے، اس میں ایک ہیروں سے زیادہ بیش بہا رسال دار کی حسین بیٹی ہے جس کا پاؤں پھسلنے سے وہ باؤلی میں ڈوبنے لگی، ہیرا اسے باہر نکال لایا، اس کے بعد کی منظر کشی مختصراً ملاحظہ ہو جس سے زورؔ صاحب کی نثر نگاری اور افسانہ نگاری کے خوب جوہر نمایاں ہیں:

''وہ دوشیزہ! اس کا جسم تو حریر و پرنیاں سے زیادہ نازک تھا، اس کی آنکھوں میں دلوں کو مسخر کر لینے والی موہنی تھی، اس کی آواز نغمہ سے زیادہ شیریں اور اس کے الفاظ جادو سے زیادہ پُر اثر تھے، اس کے جسم کی لطافت، اس کے چمکدار اور نرم نرم بالوں کی خوشبو اور اس کے تنفس کی گرمی مجھے اب تک محسوس ہو رہی تھی''۔

ڈاکٹر زورؔ کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنے مضمون ''ڈاکٹر زورؔ کی افسانہ نگاری'' میں ایک جگہ ان کی افسانہ نگاری کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے، چوتھا اور پانچواں افسانہ ''سروِ صحرا'' اور ''دفینہ'' میری رائے میں ڈاکٹر زورؔ کی بہترین افسانوی تخلیقات ہیں، ان کے جملہ افسانوں میں یہی دو افسانے جذبۂ عشق کے گرد بنے گئے ہیں، ان میں ادبِ لطیف کا ماحول ہے''۔

دیباچہ نگاری: کسی کتاب کا بغور اور بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد دیباچہ نگاری کرنا ایک گراں قدر ذمہ داری ہے اور حق یہ ہے کہ دیباچہ نگاری کا حق ادا کرنا خاصا دشوار طلب کام ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر ڈاکٹر زورؔ صاحب جیسے تصانیف کثیرہ ادیب کی دیباچہ نگاری ملاحظہ کی جائے تو ہمیں واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے کچھ اس انداز سے دیباچہ نگاری کی ہے کہ اس سے قارئین کو کتاب کی روح سمجھنے میں بآسانی مدد ملتی ہے اور قارئین مصنف و مرتب کے مقصد تحریر کو پالیتے ہیں، یہاں ایک دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے جن میں زورؔ صاحب نے اپنے معاصرین ادباء و شعراء کی کھلے دل سے پذیرائی کی اور بھرپور ان کا اعتراف کیا ہے۔

''ترجمانِ زندگی'' حضرت علی منظور کا مجموعہ کلام، حضرت علی منظور اپنے دور کے ایک منفرد شاعر تھے مگر وہ ہمارے قدیم دبستان سے تعلق رکھنے کے باعث بدلتی شعری قدروں کے پوری طرح ہم رکاب نہیں ہو سکے، گوشہ نشین رہے، ڈاکٹر زورؔ نے کس عمدگی سے ان کی شخصیت کا تجزیہ کیا ہے ملاحظہ ہو:

''ان کی گوشہ نشینی کی ایک بڑی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ بڑے ہی وضعدار واقع ہوئے ہیں اور موجودہ سوسائٹی جو ایک عبوری دور کے انتشار اور مختلف و متضاد نقاطِ نظر کے ٹکراؤ کا شکار بنی ہوئی ہے ان کی افتادِ طبع کو بہت کم بھائی ہے وہ اگرچہ اپنی وضع چھوڑ نہیں سکتے جیسا کہ ان کی اکثر نظموں اور غزلوں سے ظاہر ہوتا ہے لیکن زمانے کے جدید رجحانات سے غیر محفوظ بھی نہیں ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کچھ دور اس کے ساتھ بھی چلیں جیسا کہ ان کی چند منظومات سے ثابت ہوتا ہے لیکن اس قسم کا کلام بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنی پاس وضع سے مجبور ہیں اور چوں کہ رنگ گہرا ہو چکا ہے۔ اس کو بدلنا ان کے بس کی بات بھی نہیں، وہ اپنے رنگ ہی میں ایک ایسے باکمال شاعر ہیں اور اس وضع کو اس خوبی سے نبھاتے ہیں کہ ان میں ایک انفرادی شان پیدا ہوگئی ہے اور عہد حاضر کا کوئی شاعر اس آن بان میں ان کا حصہ دار نہیں۔ اسی طرح ''حیدرآباد کے بڑے لوگ'' کے مقدمہ میں سید غلام پنجتن

کے مزاج کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا ہے:

’’مولوی غلام پنجتن صاحب شمشاد، علی گڑھ کے کھلنڈروں اور زندہ دل فرزندوں میں سے ہیں۔ ان کی تربیت علی گڑھ کے ایک بڑے معمار نواب محسن الملک کے سایۂ عاطفت میں ہوئی اور وہ اتنے عرصے علی گڑھ میں رہے اور وہاں کے سرد گرم سے اتنے متاثر ہوئے کہ فرانس کے بادشاہ لوئی چہارم کی طرح ’علی گڑھ! یہ میں ہی ہوں‘ کہنا ان کو زیب دیتا ہے‘‘۔

’’مشتے نمونہ از خروارے‘‘ کے تحت یہ چند مثالیں پیش کی گیئں ورنہ ادباء و شعراء کی کتابوں پر لکھے گئے ان کے دیباچے واقعی لائق مطالعہ ہیں جن سے غیر معمولی طور پر ادبی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

مخطوطہ شناسی: دکن میں جن شخصیات نے اولاً مخطوطہ شناسی کی راہیں ہموار کی ہیں ان میں حکیم شمس اللہ قادری، نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر عبدالقادر سروری کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ کا کام بھی نہایت اہمیت و وقعت کا حامل ہے جنہوں نے پورے لوازمات کی رعایت کے ساتھ مخطوطہ شناسی کی ہے اور اس فن کو فروغ دینے میں اپنی صلاحیتوں کو تج دیا، چونکہ مخطوطہ شناسی کے لئے مختلف معلومات کے ساتھ ساتھ، مصنف کا نام، عہد اور زبان اور مختلف خطوط سے واقفیت ناگزیر ہے جس کے بغیر مخطوطہ شناسی کا نازک کام متصور نہیں، اس پس منظر میں ڈاکٹر زور کی مرتب کردہ کتابوں کو ملاحظہ کیا جائے تو ’’تذکرۂ اردو مخطوطات (جلد اول) مطبوعہ ۱۹۴۳ء، جلد دوم مطبوعہ ۱۹۵۱ء اور جلد سوم، چہارم اور پنجم (۱۹۵۷ ۔ ۱۹۵۸ ۔ ۱۹۵۹) وغیرہ ان کی ذہنی صلاحیتوں، بیدار مغزی اور دقت نظری پر دلالت کرتے ہیں، انہوں نے عربی، فارسی، اردو، ہندی اور سنسکرت کے ایک ہزار ایک سو مخطوطات کی توضیحات پیش کی ہیں۔

تذکرہ مخطوطات جلد پنجم کے دیباچہ (طبع اول) میں یوں لکھا ہے:

’’ادارے کے جملہ ۱۵۰ مخطوطات کے بارے میں تفصیلات (پانچ جلدوں میں) منظر عام پر آرہی ہیں ابھی چار ہزار مخطوطات ایسے ہیں جن کی ایسی ہی توضیحی فہرست مرتب اور شائع کرنی ہے اور اس تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے‘‘۔

ادارۂ ادبیات اردو کے قیام ۱۹۳۱ء سے ہی ڈاکٹر زورؔ نے مخطوطہ شناسی کے لئے جو مصیبتیں گوارا کی ہیں اس کے بارے میں خود انہوں نے یوں اظہار خیال کیا:

’’اس تذکرۂ مخطوطات کی ترتیب کے سلسلے میں مؤلف کو جو زحمتیں اٹھانی پڑی ہیں اور جو وقت صرف ہوا اس کا اندازہ وہی اصحاب کر سکتے ہیں۔ جنہیں قلمی نسخوں سے کام لینے کا تجربہ ہوا ہو، اکثر مخطوطوں کے مصنفوں کے نام یا زمانۂ تصنیف اور زمانۂ کتابت وغیرہ کی تحقیق میں بیسوں قلمی و مطبوعہ کتب کی ورق گردانی کرنی پڑی اور بڑا وقت صرف ہوا‘‘۔

ڈاکٹر زورؔ کی اس تحقیق اور مخطوطہ شناسی کی دنیا میں قدم رکھنے سے متعدد غیر معروف شعراء و ادباء کے نام اور کام سامنے آئے اور ان کے تعارف سے ادبی دنیا کو معلومات حاصل ہوئیں۔

غرض ان کی عرق ریزی سے مخطوطہ شناسی کی بڑی خدمت ہوئی، جس سے مستقبل کے مورخ کو دکنی تحقیق وغیرہ کے سلسلہ کو دیگر کڑیوں میں جوڑنا آسان ہوگیا اور یہ بھی اردو ادب کی بہت بڑی خدمت ہے۔

ڈاکٹر زورؔ کی شاعری: جو عہد طفلی ہی سے خاندانی، معاشرتی اور

علمی ماحول کا پروردہ ہو اور مستقل علمی و فنی کاموں اور شخصیتوں سے سابقہ پڑا ہو اور پیہم جسے دنیائے کتب کی سیر کرنے سے فرصت نہ ہو اور زبان و بیان پر مکمل قادر ہو اور اس میں خون کی تاثیر بھی در آئی ہو تو وہ کیسے شعر گوئی کی دولت سے تہی داماں رہ جائے گا، چنانچہ ڈاکٹر زورؔ کے والد حضرت سید غلام محمد زعمؔ اپنے وقت کے بہترین عالم و فاضل، واعظ اور ایک خوش فکر شاعر تھے اور داغؔ کے تلامذہ میں شامل تھے، اس طرح ڈاکٹر زورؔ میں شاعری کے جراثیم کا تحلیل ہونا لازمی بات ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی انتہائی مصروف زندگی میں انہیں شاعری کرنے کے مواقع کم کم ہی میسر آئے مگر ان کی شاعری کا جو ذخیرہ و سرمایہ مختلف تذکروں میں موجود ہے اس سے ان کی شاعرانہ حیثیت بخوبی آشکار ہو جاتی ہے، ان کی ایک نظم چاندنی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو زبان و بیان اور تعبیر کے اظہار پر ان کی غیر معمولی صلاحیت و قابلیت کی چغلی کھاتے ہیں: ؎

پھر ذکرِ رونقِ شبِ مہتاب آ گیا
سامانِ وحشتِ دلِ بے تاب آ گیا
موسم وہی فضاء وہی کہسار بھی وہی
اے کاش مل سکے نگہہِ یار بھی وہی
ہوگا یوں ہی فلک پہ سوا ماہِ ضوفشاں
مل جائے میرا چاند ہے وہ چاندنی کہاں

اسی طرح ان کی ایک نظم ''جامعہ عثمانیہ اور نونہالانِ دکن'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن سے ڈاکٹر زورؔ کی شاعرانہ عظمت بخوبی ہویدا ہو جاتی ہے اور جس سے ان کی طبع موزوں کی روانی خوب جھلکتی ہے اور غیر معمولی طور پر ان الفاظ و تراکیب اور قوافی و ردیف کو شعری پیرائے میں چست کرنے کا ہنر ظاہر ہوتا ہے، ملاحظہ ہوں: ؎

اس کے ہر ذرے کو رشکِ آفتاب اب دیکھئے
عظمتِ ملکِ دکن کو بے نقاب اب دیکھئے
ہو چکا منت کشی کا سدِباب اب دیکھئے
دیکھئے ہاں دیکھئے یہ انقلاب اب دیکھئے
داغ ہائے منتِ اغیار دھوتے جائیں گے
نونہالانِ وطن شاداب ہوتے جائیں گے

مختلف تذکروں اور ڈاکٹر زورؔ کی کتابوں کی مدد سے ان کی شاعرانہ لیاقت پر بآسانی ایک کتاب ترتیب دی جاسکتی ہے۔ تاہم طوالت سے گریز کرتے ہوئے ان کے چند متفرق اشعار پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

انسانیت کے رستے ہوئے زخم چھوڑ کر
دانشوروں کو چاند ستاروں کا شوق ہے
انسان مر چکا ہے مشینوں کا دور ہے
اب کیا کسی کو زہر کہ امرت پلایئے
کیا ستم ہے وہی بے نام و نشاں رہتے ہیں
جن غریبوں کے پسینے سے نکھرتی ہے زمیں
فردا کے انتظار میں کٹتی ہے زندگی
بہتر ہے روز و شب کا نہ پردہ اٹھایئے
فدا کرنا پڑے گا زورؔ ان پر دونوں چیزوں کو
مرا دل میرا دل کب تک، مری جاں میری جاں کب تک
کچھ ایسے لوگ ابھی تک چمن میں ہیں شاید
فریب خوردہ خزاں میں نہ خوش بہار میں ہیں

اے زورؔ وہ بت حسن پہ جو اپنے ہیں مغرورؔ
قابو میں نہ وہ زور سے آئیں گے نہ زر سے
موت سے بھی مریں گے نہیں زورؔ ہم
زندگی میں جو کچھ کام کرجائیں گے

ڈاکٹرزور کی خدمات کا مجموعی جائزہ :

ڈاکٹر زورؔ تقریباً ۳۴ سال تک اردو زبان و ادب کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہے اور مختلف موضوعات (تحقیق، تنقید، لسانیات، دکنیات، ترتیب وتدوین، دیباچہ نگاری، افسانہ نگاری، فارسی خدمات، صحافت، شاعری، مکتوب نگاری، مخطوطہ شناسی وغیرہ) پرانہوں نے تین درجن کے قریب تصنیفات وتالیفات کا ذخیرہ دنیائے اردو کو دیا، علاوہ ازیں ادارۂ ادبیات اردو کا قیام اور سب رس کا استحکام بھی اردو تاریخ میں ان کے نام کی اہمیت کو بڑھاتا ہے۔ان کی کتابیں کچھ اس طرح ہیں: (۱) ہندوستانی لسانیات (لکھنؤ نسیم بک ڈپو ، ۱۹۶۰ء ، ۱۱۶صفحات)، (۲) ہندوستانی صوتیات (انگریزی میں ہے، پیرس سارن بون یونیورسٹی)، ()۳) اردو شہہ پارے (مکتبہ ابراہیمیہ ،حیدرآباد ۱۹۲۹ء، ۳۵۶+ ۱۵صفحات)، (۳) عہدِ عثمانی میں اردو کی ترقی (اعظم اسٹیم پریس ، حیدرآباد، ۱۹۳۵ء ۲۰۶صفحات) (۴) داستانِ ادب حیدرآباد (ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۵۱ء، ۲۲۲صفحات)، (۵) دکنی ادب کی تاریخ ۱۹۶۵ء (کراچی ، اردو اکیڈمی سندھ ، ۱۸۸صفحات)، (۶) اردو کے اسالیب بیان ۔ طبع اول ۱۳۴۶ھ ۱۹۲۷ء ۔طبع ثانی ۔ حیدرآباد (احمد پریس ۱۹۳۲ء ، ۱۷۵صفحات ، طبع ثالث حیدرآباد ، اعظم اسٹیم پریس ۱۹۴۰ء)، (۷) روحِ تنقید ۱۹۲۵ء (۲۸۵صفحات ، شمس الاسلام پریس، حیدرآباد)، (۸) تنقیدی مقالات (حیدرآباد، مکتبہ ابراہیمہ ، (بار دوم) ، ۱۹۳۲ء ۲۴ + ۴۹۶ صفحات) (۹) ادبی تحریں (مرتبہ : گوپی چند نارنگ ۔ حیدرآباد ۔ ادارہ ادبیاتِ اردو ۱۹۶۳ء ۔۱۶۸صفحات)، (۱۰) جواہرِ سخن، حیدرآباد، عہد آفریں پریس ۔۵۲صفحات، (۱۱) تین شاعر (مرتقی میر۔ میر انیس اور ہوریس اسمتھ کا تذکرہ) کراچی ، صفیہ اکیڈیمی ۱۹۶۵ء ۱۹۸ صفحات (۱۲) مرقع سخن جلد اول حیدرآباد مکتبہ ابراہیمیہ ۱۹۳۷ء صفحات ۳۹۲ (شعراء ادباء کا تذکرہ)(۱۳) مرقعِ سخن جلد دوم سعید آباد مکتبہ ابراہیم ۱۹۳۷ء ۴۳۱صفحات (شعراء ادباء کا تذکرہ) (۱۴) گلزار ابراہیم ۔(اردو شعراء، کا تذکرہ ہے) بطور مسلم یونی ورسٹی (۱۹۳۴ء ، ۳۷۰ صفحات ۔ علی گڑھ ۔ (۱۵) تذکرۂ اردو مخطوطات، جلد اول ۱۹۴۳ء ۳۹۶صفحات) جلد دوم ، ۱۹۵۱ء ، صفحات ۱۷۶ ۔ جلد سوم ۱۹۵۷ء، ۳۸۴صفحات ، (جلد چہارم ، ۱۹۵۸ء، ۲۹۲صفحات) یہ کتابیں تذکروں پر مشتمل تھیں ، اسی طرح یہ کتابیں سوانح پر مشتمل ہیں ۔ (۱۷) گارساں دتاسی ۔ اور اس کے ہم عصر بہی خواہانِ اردو، (الہ آباد ، ہندوستانی اکیڈیمی ۱۹۳۱ء، ۱۹۸ صفحات) (۱۸) سرگزشتِ غالبؔ، (حیدرآباد ۔ ادارہ ادبیات اردو ۱۹۳۹ء، ۶۴۰ صفحات) ، (۱۹) حیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ (حیدرآباد، ادارہ ادبیات اردو ۱۹۵۸ء، ۲۲۸صفحات) ، اب یہاں سے منتخبات نظم ہیں ۔ (۲۰) کیف سخن یعنی انتخاب کلام رضی الدین حسن کیفی مع مقدمۂ زور (مکتب ابراہیمہ ۱۹۳۵ء، ۱۲۲صفحات)، (۲۱) بادۂ سخن (یعنی انتخاب کلام ڈاکٹر احمد حسین مائلؔ) ، مکتبہ ابراہیمہ ۱۹۳۵ء ، ۱۲۸ (صفحات) ، (۲۲) متاعِ سخن ، یعنی انتخاب کلام نواب عزیز

یار جنگ بہادر عزیز، شاگرد داغؔ، (حیدرآباد مکتبہ ابراہیمیہ، ۱۹۳۵ء ،۱۲۵ صفحات)، (۲۳) فیض سخن یعنی انتخاب کلام میر شمس الدین فیض، استاد کل، (مکتبہ ابراہیمیہ ۱۹۳۵ء)، رمز سخن یعنی انتخاب کلام سدانند جوگی بہاری لعل رمزؔ (حیدرآباد ادارہ ادبیات اردو ۱۹۵۱ء، ۹۶ صفحات) (۲۴) کلیات قلی قطب شاہ مع تفصیلی مقدمۂ زور (حیدرآباد مکتبہ ابراہیمیہ ۱۹۴۰ء) (۲۵) معانی سخن انتخاب کلام محمد قطب شاہ، (حیدرآباد نیشنل پرنٹنگ پریس ۱۹۵۸ء ،۱۱۲ صفحات) (۲۶) اردو شاعری کا انتخاب (از ابتداء تا زورؔ، ۱۰۸، شاعروں کے کلام انتخاب) نئی دہلی ساہتیہ اکیڈیمی ۱۹۶۰ء ۳۰۶ صفحات)، (۲۷) مثنوی طالب و موہنی (حیدرآباد ادارہ ادبیات اردو ۱۹۵۷ء)، (۲۸) روحِ غالبؔ (حیدرآباد ادارۂ ادبیات اردو، ۱۹۳۹ء، ۶۴ + ۷۵ صفحات)، (۲۹) مکاتیبِ شاد عظیم آبادی (حیدرآباد ادارۂ ادبیات اردو ۱۹۳۹، ۲۹۹ صفحات)، (۳۰) شاد اقبالؔ (مہاراجہ کشن پرشاد شاد اور علامہ اقبالؔ کی باہمی خط و کتابت اور مراسلت ہے) (حیدرآباد اداہ ادبیات اردو ۱۹۴۲ء)، اب یہاں سے افسانوں کی تعداد ہے:

(۳۱) طلسم تقدیر (خود ڈاکٹر زورؔ کا افسانہ ہے) حیدرآباد (مطبع معلم العلوم ۱۹۲۵ء، ۵۲ صفحات)، (۳۲) سیر گولکنڈہ (افسانہ) حیدرآباد انتظامی پریس ۱۹۴۲ء، ۱۶۰ صفحات (۳۳) گولکنڈہ کے ہیرے افسانہ (حیدرآباد، مکتبہ ابراہیمیہ، ۱۹۳۷ء، ۱۳۶ صفحات)، (۳۴) فن انشاء پردازی حیدرآباد، اعظم اسٹیم پریس ۱۹۳۵، ۱۱۵ صفحات (۳۵) حیدرآباد فرخندہ بنیاد (حیدرآباد طارق پریس ۱۹۵۲) ۔ (۳۶) خطبۂ صدارت اردو کانفرنس برہان پور ۔ ۱۹۵۷ء، (۳۷) قطب سلاطین اور آندھرا ۱۹۶۷ء، ص: ۵۴۵ ۔

علاوہ ازیں دیگر کتابیں اور ان گنت مضامین ہیں جو اس وقت ماہناموں (جیسے تحفہ، ارتقاء، سہیل، نیرنگ خیال، ناظر، نگار، مجلّہ عثمانیہ، تجلی، زبان، مجلّہ مکتبہ، جامعہ، اردو، رہبر دکن، کاروان، حسن کار، منشور، نظام گزٹ، آئینہ ادب، شہاب المومٰی، سب رس، عصمت، نقش اولین، نوائے ادب، آج کل، صبا، شاعر، نقوش، آندھرا پردیش، مجلس، نیا دور اور تعمیر وغیرہ میں متعدد بار اشاعت کا شرف پا چکے ہیں ۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے ڈاکٹر زور، حیات اور کارنامے، ص: ۴۶۹ تا ۴۲۸)

یہاں پیش کردہ مواد سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ڈاکٹر زورؔ نہ صرف ایک اردو کے شاعر و ادیب تھے بلکہ وہ اپنی ذات میں ایک ادبی تحریک، ادارہ اور جامع فردِ فرید تھے جنہوں نے اردو ادب میں نہایت پیش بہا خدمات انجام دیں ۔ جن پر جامعہ نظامیہ اور جامعہ عثمانیہ اور اہل دکن کو فخر و ناز ہے کہ اس کے سپوت نے یہ کار ہائے گراں مایہ انجام دئے جو ادب کی تاریخ کا ایک روشن باب ہیں، ۲۳/اور ۲۴/ستمبر ۱۹۶۲ء کی درمیانی شب ان کا انتقال ہوگیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد عظمت اللہ خان احساسؔ
ایس اے، ای آر پی، محکمہ تعلیمات
حیدرآباد، تلنگانہ
موبائل: 9705853523

''روشن ستارے'' بر فلک ادبِ اطفال

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ٥

(سورۃ الاعراف:۱۷۶)

'' قصے بیان کرتے رہوتا کہ لوگ سوچ وچار کریں۔''

کہانی ــــــ ازل سے کہی جاتی رہی ہے اور تا ابد یہ سلسلہ یوں ہی قائم رہے گا۔

ایک اور مقام پر قرآن مجید میں سورۂ یوسف کی آیت نمبر:۳ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ أَحْسَنَ الْقَصَصِ ۔(سورۃ یوسف:۳)

'' آؤ ہم تمہیں اچھا قصہ سناتے ہیں۔''

اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ''کہانی'' کہنا ایک احسن عمل ہے، یہی وجہ ہے کہ کہانی ابتدائے آفرینش سے ہی مختلف انداز میں کہی جاتی رہی ہے، اس وقت بھی جب دنیا میں کاغذ قلم ایجاد نہیں ہوا تھا۔

ابھی پچھلی صدی تک بھی ہم نے دیکھا کہانیاں دادی، نانی، پھوپھی، چاچی، ماں، ماں جائی کے توسط سے ننھے ذہنوں کی پرورش اور اخلاقی تربیت کا ذریعہ تھیں، اس توسط کو ''زبانی ادب'' کہا جاتا ہے، یہ کہانیاں چھوٹی چھوٹی حکایتوں، داستانوں، گیتوں اور لوریوں کی شکل میں ہوتیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا تھا:

''ٹھیک سے دیکھنے پر بچہ جیسی پرانی چیز اور کوئی نہیں۔''

بچہ خواہ کسی قوم، کسی ملک یا کسی بھی علاقے میں پیدا ہوا، غور کرو تو محسوس ہوگا کہ روزِ اول جیسا تھا ــــــ ویسا ہی ہے۔ ساری آلائشوں سے پاک، غلاظتوں سے مبرّا، بالکل کورے کاغذ کی طرح صاف اور شفاف۔ کیوں کہ بچہ خدا کی دین ہے، اس کی فطرت میں کھوٹ شامل نہیں ہوتی۔ بعدازاں مرورِ وقت کے ساتھ جھوٹ اور مصلحتوں کی ملمع کاری، اس کے ماحول کے مطابق اس کی شخصیت سازی کرتی ہے۔ اب یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس نوخیز ذہن کی پرورش کے لئے صحت مند ماحول تیار کریں۔

جس طرح اچھی جسمانی صحت کے لئے صاف ستھری اور متوازن غذا کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح ذہنی پرورش کے لئے اچھے ادب کی ضرورت ہوتی ہے۔ مہذب اور ترقی پذیر دنیا نے جہاں اس ضرورت کو محسوس کیا وہیں یہ خطرہ بھی محسوس کیا کہ وقت کی سیلِ رواں کے ساتھ یہ زبانی ادب معدوم ہو جائے گا۔ لہٰذا قلم و قرطاس کے ذریعہ اسے محفوظ کرنے کی کاوشیں شروع ہوئیں۔

اس طرح ایک اندازے کے مطابق یہ زبانی کہانیاں اور قصے کم از کم پانچویں صدی سے قبل ہی تحفظ کے دائرے میں آگئیں۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے کہ ''بچہ'' قوم کا مستقبل ہوتا ہے۔ چنانچہ قوم کی چند ذمہ دار شخصیتوں، سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے اس ضرورت کی طرف توجہ دی اور اس پر عمل درآمد

مضامین

کیا۔ آج ہندوستان میں بیشمار سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اس ذمہ داری کو بحُسن وخوبی نبھار ہے ہیں۔

۱۹۶۴-۶۵ء میں بچوں کے رسالے ''کھلونا''، ''پیامِ تعلیم'' اور ''کلیاں'' جیسے رسالوں نے نوخیز ذہنوں کی پرورش میں مثبت رول ادا کیا۔ ان رسالوں میں نہ صرف سبق آموز قصے بلکہ سلسلہ وار کہانیاں چھاپی جاتی تھیں جو بچوں میں ذوقِ مطالعہ اور تجسس کو بڑھاوا دیتے تھے۔ ''گھر کا بھیدی'' اور ''چچا مرغ سسرال گئے'' ایسی قسط وار کہانیاں تھیں جس کی وجہ سے بچوں کو دوسرا رسالہ آنے تک صبر کرنا دشوار لگتا۔ 'پیامِ تعلیم' ایک معلوماتی رسالہ ہوتا۔ اس رسالے نے نت نئے انداز میں تعلیمی پیغام کو پھیلایا۔ ہاں مگر 'کھلونا' سب سے منفرد رسالہ تھا۔ یہ رسالہ چھ(۶) سے اسّی (۸۰) سال کے قارئین میں بھی برابر کا مقبول تھا۔ اس کے مضامین میں تنوع ہوتا۔ مستزاد یہ کہ کہانیاں باتصویر ہوا کرتیں جو ننھے قارئین کو لبھاتیں۔ 'میاں فولادی'، 'تاریخ پارے'، 'نو پھول راج کماری'، ''نیلی کھوپڑی'، 'چندا ماموں'، 'سرکس کے کھیل' اور 'گھسیٹا کی بھتنا شاہی' آج بھی بوڑھے حافظوں میں محفوظ ہیں۔

ہمارے بچپن میں دہلی، بمبئی اور رامپور سے رسالے آیا کرتے تھے۔ ہم ان شہروں کی بچہ دوستی کو فراموش نہیں کرسکتے۔ حق بات تو یہ ہے کہ یہ بارِ گراں سرکاری اداروں سے زیادہ خانگی اداروں نے اٹھایا، آج بھی بمبئی سے فاروق سید ''گل بوٹے'' کے نام سے یہ نیک کام کررہے ہیں۔ ماضی بعید میں انفرادی طور پر ادبِ اطفال پر نظم ونثر دونوں اصناف میں علم وادب کے جید قلمکاروں نے بہت کچھ لکھا۔ مثلاً اسماعیل میرٹھی کی نظمیں: برسات، دال چپاتی، گرما کا موسم، پن چکّی، ریل گاڑی' بلکہ یوں کہو تو اسماعیل میرٹھی کا پورے کا پورا بنیادی کام ادبِ اطفال سے متعلق رہا۔ امیر خسرو کی نظم ''خالقِ باری'، غالب کا ''قادر نامہ'، میر کی ''موہنی بلی'، نظیر اکبرآبادی کی 'تل کے لڈو'، 'روٹی نامہ' اور اقبال کی متعدد نظمیں 'پرندے کی فریاد، پہاڑ اور گلہری، گائے اور بکری، ماں کا خواب، جگنو، مکڑا، اور مکھی' وغیرہ اور نثری ادب میں ڈاکٹر ذاکر حسین کی 'ابو جان کی بکری'، پریم چند کی 'نادان دوست' احمد ندیم قاسمی کی 'چوہوں کی بارات' کہانیاں اور عہدِ حاضر میں جناب حافظ کرناٹکی جن کی ادبِ اطفال پر ننانوے (۹۹) کتابیں منظرِ عام پر آچکیں اور سوویں کتاب زیرِ ترتیب ہے۔ یہ سارا ادب قوم کی تعمیر کے لئے وجود میں آیا۔ یہ قلمکار قوم کے بڑے معمار ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

۱۹۷۵ء میں ریاست حیدرآباد میں اردو اکاڈمی کا قیام عمل میں آیا، اس کاڈمی نے پرانے لکھنے والوں کی ادبی خدمات کے اعتراف اور نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی اور پذیرائی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ مگر بچوں کے رسالہ نکالنے میں تقریباً پینتالیس سال لگ گئے اور ایک مدت بعد ۲۰۱۹ء میں اردو اکاڈمی ریاست تلنگانہ حیدرآباد کے سابق صدرنشین عالی جناب محمد رحیم الدین انصاری نے رسالہ اطفال کی ضرورت کو محسوس کیا اور نہایت جستجو اور تگ ودو سے ''روشن ستارے'' کے نام سے ماہنامہ جاری کیا جسے حیدرآباد ہی نہیں بلکہ ہندوستان

کے مہذب طبقے نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

مگر کچھ مہینوں بعد ہی رسالے کو کسی کی نظر لگ گئی۔

ٹائٹل رجسٹرین جو Pending Approval تھا، کی غیر موجودگی کی پاداش میں کچھ مہینوں کے لئے رسالہ تعطل کا شکار ہوگیا۔ بفضلِ تعالیٰ اب بڑی پابندی سے نکل رہا ہے۔

روشن ستارے اپنی عمر کے لحاظ سے ابھی ایامِ طفلگی سے ہی گذر رہا ہے مگر صوری، بصری اور معنوی اعتبار سے جوانی کی حد میں داخل ہو چکا ہے۔ آفریں ہیں اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر محمد غوث صاحب' ڈائریکٹر/ سکریٹری اکاڈمی جن کی سرپرستی میں یہ رسالہ نکلتا ہے اور جناب سردار سلیم صاحب، نائب مدیر جو اس رسالے کے کرتا دھرتا ہیں' جن کی شب و روز کی تگ و دو نے اتنی کم مدت میں رسالے کو یہ اعتبار بخشا۔

۴۸ صفحات پر مبنی ''روشن ستارے'' کی تزئین و ترتیب اور مواد کی تبویب نہایت ماہرانہ انداز میں کی گئی ہے۔ بصری اعتبار سے بھی رسالہ کیا بچے کیا بوڑھے سب کے دل موہ لیتا ہے۔ اول تو اس کا سرورق اور اندرونی صفحات پر باتصویر کہانیاں بچوں کے لئے جاذب نظر ہیں۔ بچوں کی نفسیات اور ذہنی اپج کے لحاظ سے مواد کی مناسب انداز میں زُمرہ بندی کی گئی ہے جو اس رسالے کی کامیابی کی ضامن ہے۔

رسالے میں رُلا ملا کر کل بارہ (۱۲) موضوعات کو نہایت ہنرمندی سے مرتب کیا گیا ہے۔ ان ۴۸ صفحات میں بچوں کے مزاج اور مذاق کے مطابق ذہنی اور اخلاقی تربیت کا پورا سامان موجود ہے۔ صوری اعتبار سے سرِ ورق جاذب نظر ہے جو بچوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے۔ سرورق کے اندرونِ صفحہ پر نونہالوں کی روشن تصویریں ہیں۔ اور آخری صفحے پر ادب عالیہ سے کسی مشہور شاعر کی نظم ہوا کرتی ہے۔

اندراجات میں سب سے اول: بچوں سے گفتگو کے عنوان سے اداریہ ہے جسے مدیرِ رسالہ ڈاکٹر محمد غوث صاحب' ڈائریکٹر/ سکریٹری اکاڈمی تحریر فرماتے ہیں۔ پھر حمدِ باری تعالی اور ثنائے رسول، چوتھے، زمرے میں سائنس پر مبنی مضامین، اس کے بعد معاونین قلم کاروں کی کہانیاں، مضامین اور شعری تخلیقات ہوتی ہیں۔ چھٹا زمرہ ''ننھے قلمکاروں کا صفحہ'' اس زمرے کا میں دل سے خیر مقدم کرتی ہوں۔ یہ زمرہ ننھے قلمکاروں کی رشحات کے لئے مختص ہے۔ اس اختراع پر میں اکاڈمی کی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا۔ آج کی نسل بے حد زیرک اور Talented ہے۔ ان کی تخیلی پرواز بہت اونچی ہے۔ انہیں پرواز کے لئے کھلا آسمان تو ہے مگر سمت کا یقین چیستاں ہے۔ انہیں ایک ایسے سہارے کی ضرورت ہے جو انہیں اظہار کی آزادی تو دے' ساتھ ہی سمت کا تعین بھی کر سکے۔ ''روشن ستارے'' کے مرتبین نے اس ضرورت کو محسوس کیا۔ یہ ایک تعمیری اقدام ہے جس کے لئے میں اربابِ مجاز کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ ساتویں زمرے ''ہنسو اور ہنساؤ'': میں لطیفوں کا چٹخارہ خوب ہے۔

آٹھ تا گیارہ زمرے صرف اور صرف بچوں کے عملی تجربوں اور مشقوں کے لئے مخصوص ہیں۔ ان میں کوئز، چیستاں، تصویروں اور لفظوں کو جوڑ کر محاورے ترتیب دینا،

مضامین

بکھرے حرفوں کو جوڑ کر الفاظ بنانا،' آؤ اردو سیکھیں' کے تحت جملے بنانا، نقطوں کو جوڑ کر تصویریں بنانا، تصویروں میں رنگ بھرنا' جیسی مشقیں ہونہار ذہنوں کی تربیت کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ آخر میں زمرہ نمبر (۱۲) میں ''تعلیمی خبر نامہ'' کے تحت کسی بھی تعلیمی ادارے کی بہت مختصر خبریں چھپتی ہیں۔

''روشن ستارے'' کو بہترین قلمکاروں کا تعاون حاصل ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدیر صاحبان کے مراسم یعنی Social Report بہت اچھا ہے۔ اتنی کم مدت میں ہندوستان کی ہر ریاست سے قلمی تعاون حاصل ہے جو اپنے آپ میں بڑی بات ہے۔

بچوں کے نامور ادیب: سراج عظیم (دہلی)، ڈاکٹر بانو سرتاج (مہاراشٹرا)، جناب پرویز شہریار (دہلی)، جناب رونق جمال (چھتیس گڑھ)، قاضی مشتاق احمد (مہاراشٹرا)، جناب اشتیاق سعید (ممبئی)، جناب قمر سلیم (مہاراشٹرا)، جناب مختار ٹونکی (راجستھان)، مسعود جاوید ہاشمی، انور ادیب، قمر ہاشمی، کوثر صدیقی، عزیز احمد عرسی کے علاوہ دہلی سے جناب محمد خلیل، محترمہ زیب النساء' مہاراشٹرا سے شہ تاج خان، رحیم رضا، رفیق گلاب، حیدر بیابانی اور آفتاب حسنین' کرناٹک سے ظہیر رانی بنوری' بنگال سے فیروز اختر' اتر پردیش سے ڈاکٹر رضاء الرحمٰن، عاکف سنبھلی' حیدرآباد سے راقم قمر جمالی، ڈاکٹر مجید بیدار، رفیعہ نوشین، ڈاکٹر ناظم علی، مومن خان شوق، ثریا جبین، ڈاکٹرم۔ق۔سلیم' ظفر فاروقی، عاتکہ نور، کشور سلطانہ اور کڑپہ آندھرا پردیش سے ستار فیضی وغیرہ شامل ہیں۔

یہ ایک ادھوری سی اور آج تک کی فہرست ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ رسالے کے نہج کو دیکھتے ہوئے یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کہ ان شاءاللہ ''روشن ستارے'' بہت جلد اسم بامسمّٰی ثابت ہوگا اور برفلکِ ادبِ اطفال ستارہ بن کر چمکے گا۔

آخر میں دو باتیں دل کی: اول یہ کہ رسالے کو باتصویر بنانے میں جس مصوّر کی خدمات حاصل ہیں وہ لائق ستائش ہے۔ مصوّر کا نام مخفی رکھا گیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ ظاہر ہو۔

دوم یہ کہ ''ننھے قلمکاروں کا صفحہ'' کے تحت ایک ہی صفحہ مختص کیا گیا ہے۔ میری رائے ہے کہ اسے ''ننھے قلمکاروں کا صفحہ'' کے بجائے ''ننھے قلمکاروں کی رشحات'' یا پھر جو بھی اکاڈمی مناسب سمجھے رکھیں تاکہ ایک صفحے کی پابندی نہ ہوتا کہ اگر کسی بچے کی کہانی دو صفحوں تک جاتی ہے تو وہ رسالے میں جگہ پانے سے محروم نہ ہو۔

میں دل کی گہرائی سے مدیر صاحبان ''روشن ستارے'' کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ دعاء کرتی ہوں کہ:

ننھے پودے مرے شجر ہوجائیں
فاختاؤں کے ان میں گھر ہوجائیں
ذرّہ ذات میں ہیں سمٹے ہوئے
ہم جو پھیلیں تو بحر و بر ہوجائیں

(عارف شفیق، کراچی)

مکان نمبر: 5-4، ہیما گری نگر کالونی، گندم گوڑہ، حیدر شاہ کوٹ، حیدرآباد۔ 500091، تلنگانہ اسٹیٹ، انڈیا
فون نمبر: 9985503977

ریاضی کا خوف: اسباب اور حل

خلاصہ: ریاضی ہماری زندگی کے ہر پہلو سے متعلق ایک ضروری اور منطقی مضمون ہے۔ ریاضی کو حسابات، اعداد، شکلوں، پیمائش، مقدار اور سمت وغیرہ کی سائنس کہا جاتا ہے۔اسکول کی سطح پر ریاضی کوسب سے بڑا ڈراونا مضمون سمجھا جاتا ہے۔کچھ طلبہ ریاضی کے سوالات کو آسانی کے ساتھ حل کردیتے ہیں،تو وہیں بیشتر طلبہ میں اس کی وجہ سے خوف اور ناکامی کا احساس رہتا ہے۔

آخر کچھ طلبہ کو ریاضی سے ڈر کیوں لگتا ہے؟ کیا ریاضی میں آنے والے اس مسئلہ کی وجہ ریاضی کی نوعیت ہے یا اسے پڑھائے جانے کا انداز یا پھر یہ دونوں؟ وہ کونسی وجوہات ہیں جو ریاضی کو لے کر طلبہ میں خوف پیدا کرتی ہیں؟ طلبہ کے ریاضی کے خوف کو کس طرح دور کیا جاسکتا ہے؟

اس مضمون میں انہی نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تعارف: ریاضی کو اسکولی مضامین میں اہم ترین مضمون کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ریاضی پڑھنے لکھنے کا مقصد صرف اعداد اوران کے حل کردینے کی معلومات کو پُر کردینا نہیں ہے، بلکہ ریاضی کا مقصد کسی فرد میں ایسی استعداد کو فروغ دینا ہے جس سے اس کے اندر استدلال، تجزیہ، سوچنے سمجھنے کی قابلیت وصلاحیت وغیرہ پیدا کرنا ہے۔(قومی تعلیمی پالیسی۔ 1986)۔

ریاضی کو اسکول کی تعلیم کا ایک اہم حصہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس کا ہر مضمون سے مثبت تعلق ہوتا ہے اور ہم روزمرہ کی زندگی میں ریاضی کا استعمال کرتے ہیں۔اس کے مطالعہ سے طلبہ میں خوداعتمادی اور خودانحصاری پیدا ہوتی ہے۔ ریاضی میں مجرد مفروضوں کی وضاحت کی جاتی ہے۔ لاک کے مطابق'' ریاضی وہ شاہراہ ہے جس کے ذریعہ بچوں کے دماغ اور ذہین میں استدلال کی عادت پیدا ہوتی ہے۔''

ریاضی کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے راجر بیکن (Roger Bacon) نے سچ ہی کہا :''ریاضی تمام علوم کا دروازہ اور کلید ہے''۔

آج اسکولوں میں ریاضی کی تعلیم کے مقاصد کو صحیح طریقے سے پورا نہیں کیا جارہا ہے، اسکولی ریاضی سے متعلق وسائل کے مطالعہ اور کلاس میں طلبہ سے ریاضی کے مضمون پر گفتگو کرنے سے بہت سارے مسائل سامنے آتے ہیں۔ جس میں ریاضی کا خوف ایک سنگین مسئلہ ہے، جس کے حل کے لیے کوششیں جاری ہیں۔

ریاضی کا خوف: ریاضی سے ڈرنے کو ہی ریاضی کا خوف کہا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ،'ریاضی کے متعلق بے بسی کا احساس ہونا یا خود کو ریاضی کے مفروضوں اور سوالوں کو حل کرنے سے قاصر سمجھنا ہی ریاضی کا خوف ہے۔'

ریاضی کا خوف ہی بچوں کی ریاضی میں منفی کارکردگی کی سب سے بڑا سبب ہے۔ باصلاحیت طلبہ بھی

ریاضی کے خوف سے دوچار پائے گئے۔ وسائل سے پتہ چلتا ہے کہ زیادہ تر طلبہ ابتداء ہی سے ریاضی سے خوفزدہ ہیں۔ ریاضی کے خوف کا اثر بچوں کی ریاضی کی کارکردگی کے ساتھ ساتھ ان کے ہمہ جہت ترقی پر بھی پڑ رہا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ طلباء کے ذہنوں میں ریاضی کا خوف کیوں پیدا ہوتا ہے؟

ریاضی کے خوف کے اسباب: ریاضی اس مضمون کو طلباء زندگی کا سب سے مشکل مضمون سمجھ کر ہمیشہ خوفزدہ رہتے ہیں جس کی وجہ سے کلاس میں ریاضی کی پڑھائی میں ان کی دلچسپی نہ کے برابر رہتی ہے۔ ہمارے ملک میں ابتداء ہی سے ریاضی کو اہم ترین مضمون سمجھا جاتا رہا ہے۔ ریاضی کو ثقافت اور تہذیب کی تشکیل اور ان کی نشو و ارتقاء کرنے والا مضمون سمجھا جاتا ہے۔ ہر فرد کو راست یا بالراست طور پر ریاضی کے علم سے واقفیت ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ریاضی کے علم کی کمی کی وجہ سے وہ اپنی خاندانی اور معاشرتی ذمہ داریوں کو بھی بخوبی نہیں نبھا سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں ریاضی اسکولی سطح پر ایک لازمی مضمون ہے۔ ریاضی کی غلط پڑھائی اور منفی سوچ کی وجہ سے، طلباء ریاضی میں ناکامی سے خوفزدہ رہتے ہیں اور جلد ہی وہ ریاضی کی سنجیدہ پڑھائی سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ریاضی پر مبنی تمام مضامین اسے مشکل معلوم ہوتے ہیں اور طلباء ریاضی کے متعلق تناو کا شکار ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے بچے ریاضی سے بھاگنے لگتے ہیں اور وہ ریاضی کے متعلق منفی رویہ اختیار کرنے لگتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ایک منفی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے اور طلباء ریاضی اور ریاضی سے متعلق تمام مضامین سے خوفزدہ رہتے ہیں۔

جب ہم نے کچھ طلباء سے ریاضی کے منفی رویہ کے بارے میں پوچھا تو ریاضی کے متعلق ان کا ردعمل اس طرح سامنے آیا:

تقریباً 40 فی صد طلباء کو یہ کہتے ہوئے پایا گیا کہ،

- مجھے ریاضی بہت مشکل معلوم ہوتی ہے۔
- ریاضی مشکل ہے،
- میں ریاضی نہیں کر سکتا۔ وغیرہ۔

اس کے علاوہ 50% طلباء کا ردعمل کچھ اس طرح رہا۔

- میں ریاضی میں کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔
- میں ریاضی کی کلاس کے دوران اکتا جاتا ہوں۔
- ریاضی کو چھوڑ کر سبھی مضامین میں مجھے اچھے نمبرات ملتے ہیں۔

جبکہ % 10 طلباء نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس کے علاوہ ریاضی کے کچھ اساتذہ نے ہمیں بچوں میں ریاضی کے خوف کی ایک وجہ بچوں کا ریاضی کا کمزور پس منظر بتایا، ان کا موقف تھا کہ ریاضی میں جو موضوع آگے آتا ہے اس کا انحصار پچھلے موضوع پر ہوتا ہے۔ جیسے تفریقی مساوات کو تفریق اور جمع کے آنے پر ہی حل کیا جاسکتا ہے۔ 3D سے پہلے 2D کو سمجھنا ضروری ہے۔ مربع کو جاننے سے پہلے ہمیں نقطہ، لکیر، زاویہ، مثلث وغیرہ کو جاننے کی ضرورت ہے ورنہ اگر ہم ایک کو چھوڑ دیں تو دوسرا سمجھ میں نہیں آتا۔ اسی

طرح ،تقسیم کے سوالات سے پہلے ہمیں جمع ،تفریق ،ضرب وغیرہ سیکھنا پڑتا ہے۔ اگر ہم پہلی (Step) کو چھوڑ دیں تو دوسری سمجھ میں نہیں آئے گی ،جس کا مطلب ہے کہ ان بچوں کے لئے جن کا ریاضی کا پس منظر کمزور ہے ، ریاضی بعد میں ایک مشکل مضمون بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ، بچوں میں ریاضی کے بارے میں منفی رویہ پیدا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ بچوں میں ریاضی کی مساوات ،اعداد وغیرہ کے بارے میں ایک خاص قسم کا خوف پایا گیا۔ جس کی وجہ سے بچے ریاضی کے لیکچر ، ریاضی پر گفتگو اور ریاضی کی کلاس میں جانے سے کترانے لگتے ہیں۔

اسکولوں میں ریاضی کے استاد کی کمی یا ریاضی کو دوسرے مضامین کے اساتذہ کے ذریعہ پڑھایا جانا ،جنہیں ریاضی سے واقفیت نہیں رہتی ، ایسے اساتذہ بچوں کو ریاضی کی مکمل معلومات نہیں دے پاتے۔ (اولانیان اور سیل مین۔ 2015)۔

اگر اساتذہ کمزور اور ذہین طلباء کو ساتھ لے کر ان کی حوصلہ افزائی کریں تو طلباء کو ریاضی میں سیکھنے میں کم مسائل آئیں گے۔ ریاضی کی تدریس میں اساتذہ کا موثر تدریسی طریقہ کو بروئے کار نہ لانا بھی بچوں کے ذہنوں میں ریاضی کا خوف پیدا کرنے کی ایک اہم وجہ بن کر سامنے آئی ہے۔ (یاپا اور فسائی۔ 2012)۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ریاضی سیکھنے میں منفی، ریاضی کا کمزور پس منظر، ریاضی کے بارے میں منفی طرز عمل، ریاضی کی تجریدی نوعیت ، ریاضی میں اچھے تدریسی مواد کی کمی ، گننے کی صلاحیت کا فقدان (Dyscalculia) ، اعتماد کا فقدان ، ریاضی میں بنیادی کمزوری ، نصابی دشواریاں ، نصاب یا قدر پیمائش کے طریقہ کار میں نقائص ، شماریات (حساب کتاب) پر زیادہ زور ، ریاضیاتی طریقہ سے سوچ کا فقدان ، ناقص رہنمائی ، روایتی طریقہ تدریس کا استعمال ، سرگرمیوں کی کمی اور عمومی تجربات ریاضی کی بنیاد کو کمزور کردیتے ہیں اور طلباء ریاضی کو لے کر تناو کا شکار ہوجاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ریاضی میں بچوں کی منفی سوچ کی ذمہ داری بھی معاشرے کی قدامت پسندی پر ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لڑکیاں پیدائشی طور پر کمزور ہوتی ہیں یا لڑکیوں میں ریاضی کی مہارت کم ہوتی ہے جبکہ لڑکوں میں ریاضی کی مہارت پیدائشی ہوتی ہے۔ جب میں نے کلاس کے اپنے طلباء جن میں لڑکیاں بھی شامل تھیں سے کچھ ریاضی دانوں کے نام لکھنے کو کہا تب 90% نے مرد ریاضی داں جیسے بھاسکراچاریہ ، آریہ بھٹ ، سری نواس رامانوجن وغیرہ کے نام لکھے ،صرف 10% طلباء وطالبات نے صرف ایک خاتون ریاضی داں شکنتلا دیوی کا نام لکھا۔ اس کی ایک بنیادی وجہ ہماری نصابی کتب میں زیادہ تر مرد ریاضی دانوں کی تفصیلات دی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی لڑکی ریاضی میں اچھے نمبرات حاصل کرتی ہے تو لوگ عام طور پر اس کی خصوصی محنت کو اس کی خاص وجہ بتاتے ہیں ، اور جب لڑکے اچھے نمبر

حاصل کرتے ہیں تو اسے وہ اس کی پیدائشی خصوصیت سے وابستہ کرتے ہیں۔اس کے علاوہ ہمارے سماج میں ریاضیاتی توہمات بھی رائج ہیں۔ جیسے ریاضی بہت مشکل ہے، ریاضی دلچسپ نہیں ہے، ریاضی کے اساتذہ بہت سخت ہوتے ہیں، تمام لڑکیاں ریاضی میں کمزور ہوتی ہیں۔صرف ذہین طلباء ہی ریاضی پڑھ سکھتے ہیں۔(تری ویدی، 2012) وغیرہ بھی طلباء میں منفی رویہ اور ریاضی کو تناو والا مضمون بنانے کے ذمہ دار ہیں۔ بہت سی تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ ان تمام توہمات اور مفروضوں کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں ہے۔

NCF-2005 کے مطابق:

- ہر بچہ ریاضی سیکھ سکتا ہے۔
- ریاضی ہر ایک بچے کی ضرورت ہے۔

تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ریاضی کے بارے میں منفی رویہ ایک سیکھا ہوا ردعمل ہے، اگر اسے سیکھا جا سکتا ہے تو اسے بھلایا بھی جا سکتا ہے ریاضی کا ایک ایسا مثبت ماحول پیدا کیا جا سکتا ہے جس میں بچے ریاضی سے خوفزدہ ہونے کے بجائے ریاضی سے لطف اندوز ہوں، ریاضی پر تبادلہ خیال کریں، ریاضی کے مسائل حل کریں اور ریاضی کے بنیادی ڈھانچہ کو سمجھیں۔

ریاضی کا ڈر کیسے دور کریں؟: ریاضی کے خوف پر قابو پانے کے طریقے درج ذیل ہیں:

ریاضی کی تعلیم میں خوشگوار ماحول کی ضرورت: "بچوں کے لیے بستے کے بوجھ سے بھی بدتر ہے، نہ سمجھ پانے کا بوجھ" - پروفیسر یش پال کمیٹی (بوجھ کے بغیر تعلیم) ۔1993:

ریاضی کے استاد کو اپنے مضمون کا جتنا علم ہونا چاہیے، اتنا ہی علم اسے اپنے طالب علم کے بارے میں بھی ہونا چاہیے تاکہ وہ ہر بچے کی صلاحیت کو سمجھ سکے اور اس کے مسئلے کو آسان بنا سکے اور اس میں ریاضی کے خوف کا تدارک کر سکے۔ ریاضی کے استاد کو ایسے طریقے اپنانے چاہئے جس کے ذریعے بچے میں ریاضی سے دلچسپی پیدا ہو اور طلباء خوشی سے ریاضی کا پڑھ سکیں۔ بچوں اندخوشی کے ماحول کو پیدا کریں کیونکہ خوش رہنے والے بچے جلدی سیکھتے ہیں اور ان میں زیادہ تخلیقی سوچ پیدا ہوتی ہے۔ وہ ہر شعبے میں اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ ناکامی سے نہیں ڈرتے اور پوری ہمت کے ساتھ حالات کا سامنا کرتے ہیں۔ اپنی ناکامی کی وجوہات کا پتہ لگا کر اسے دور کرتے ہیں۔اس طرح طلباء جلدی کامیابی حاصل کرتے ہیں۔ ریاضی ایک دماغی کھیل ہے۔ ریاضی کو خوشی سے سیکھنے کے لیے بچوں کو آزادی دینا بھی ضروری ہے۔اس کے لیے اسکول میں ایسا طریقہ کار اپنایا جانا چاہیے جس سے طلباء غلطیوں کے خوف کے بغیر اور ناکامی کے خوف کے بغیر آزادانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکیں اور ریاضی کی تعلیم حاصل کر سکیں۔

بچوں کو ریاضی کی اہمیت کی تعلیم دینا: طلباء میں ریاضی کی دلچسپی بڑھانے کے لیے انہیں بتانا چاہیے کہ بیرونی زندگی میں ریاضی کا کیا استعمال ہے اور بچوں کو یہ بھی بتایا جائے کہ ریاضی کا دیگر مضامین سے کیا تعلق ہے۔اور اگر ہم ریاضی کو سمجھ سکتے

ہیں تو ہمارے لیے بہت سارے مضامین آسان ہوں گے۔

ہمارے ملک میں زمانہ قدیم ہی سے ریاضی کو بطور مضمون بہت اہمیت دی جاتی رہی ہے۔ موجودہ دور میں بھی ہماری زندگی میں ریاضی کی بے حد اہمیت ہے۔ طلباء کو ریاضی کی اہمیت اور دیگر مضامین کے ساتھ ریاضی کے تعلق کو اجاگر کر کے بچوں میں ریاضی سے دلچسپی پیدا کی جاسکتی ہے۔ ریاضی کا استعمال ہماری روزمرہ کی زندگی میں تقریباً ہر جگہ ہوتا ہے۔ ایک کسان سے لے کر ڈاکٹر، مزدور سے انجینئر، طالب علم سے تاجر، گھریلو کام سے لے کر بازار کی خریداری تک، ریاضی ہر جگہ استعمال ہو رہی ہے، یعنی ہر جگہ ریاضی ہے۔ ریاضی کا تمام مضامین کے ساتھ مثبت تعلق ہے۔ یعنی اگر کسی طالب علم کی ریاضی اچھی ہو تو سائنس جیسے مضامین بھی اچھے ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ، ریاضی کے مطالعہ سے طلباء میں استدلال کی عادت، ذہنی قوتوں کی ترقی، تخلیقی سوچ اور مسائل کو حل کرنے جیسی صلاحیتیں بھی فروغ پاتی ہیں۔ بچوں میں ریاضی کے ذریعے جمالیاتی، جذباتی، سماجی، سائنسی، عملی اور اخلاقی اقدار بھی پروان چڑھتی ہیں۔ اس طرح بچوں کو ریاضی کی اہمیت بتا کر ریاضی کے متعلق ان میں دلچسپی پیدا کی جاسکتی ہے۔

روزمرہ زندگی سے ریاضی کو جوڑنا: ریاضی کو بچوں کی روزمرہ کی زندگی سے جوڑ کر سکھایا جانا چاہیے تا کہ وہ ریاضی کی عملیت اور اطلاق سے واقفیت حاصل کر سکیں اور ریاضی کی بنیادی ساخت کو سمجھ سکیں۔ قومی نصاب کے خاکہ (2005) کی تجویز ہے کہ بچے کی اسکول کی زندگی کو بیرونی زندگی سے جوڑنا چاہیے اور ہر مضمون کو ایک مضبوط دیوار سے گھیرے اور معلومات کو رٹا دینے کے رجحان کو روکنا چاہئے اور اسکول میں ایک چھوٹے سے سماج کا ماحول پیدا کرنا چاہیے جو سیکھنے اور کھیل کے ذریعے سیکھنے پر مبنی ہو۔ مہاتما گاندھی کے مطابق اسکول اور گھر کے درمیان تال میل ہونا چاہیے، تجارت اور تعلیم کے درمیان تال میل ہونا چاہیے۔ انہوں نے بنیادی تعلیم میں ربط کو اہمیت دی ہے۔ ہمیں ریاضی کی تدریس طلباء کی روزمرہ کی زندگی سے جوڑ کر کرنا ہوگا تا کہ بچہ اپنے آپ کو سماج سے جوڑ سکے۔ ریاضی ہر جگہ موجود ہے۔ ریاضی سے کوئی چیز بھی چھوٹی ہوئی نہیں ہے۔ ہمیں بچوں کے تجربے اور پیشگی معلومات کا استعمال کرتے ہوئے بچوں کو سماج سے جوڑنا ہے تا کہ بچہ سیکھی ہوئے ریاضی کو سماجی مسائل کے حل کے لیے استعمال کر سکے۔ اسی بات کی تائید کرتے ہوئے، رابندر ناتھ ٹیگور جی نے یہ بھی کہا ہے کہ، "بہترین تعلیم وہ ہے جو ہمیں نہ صرف معلومات اور علم مہیا کرتی ہو، بلکہ ہماری زندگی کا دنیا کے تمام جانداروں کے ساتھ تعلق بھی پیدا کرتی ہو۔"

ریاضی کا کمرۂ جماعت: اسکول کا ماحول بھی ریاضی سیکھنے کے عمل کو فروغ دیتا ہے۔ بچے بھی اسکول ہی کا حصہ ہیں۔ وہ اسکول کے ماحول کے ساتھ ربط میں رہتے ہیں۔ اسکول کی دیواریں، کونے، کھڑکیاں، دروازے، سیڑھیاں وغیرہ بھی ریاضی کے وسائل کے طور پر استعمال ہونے چاہئے۔ ریاضی شکلوں کا بھی مطالعہ ہے، اس لیے اسکول کی عمارت کی تعمیر میں شکل، ڈیزائن، پیٹرن، ساخت، ٹائلنگ وغیرہ پر خصوصی توجہ

دی جانی چاہیئے ۔ کمرۂ جماعت کے کونے کے زاویے، پنکھے کا دائرہ، ٹیبل بورڈ مستطیل اور کھڑکیوں کا کونہ، متوازی اور عمودی لکیر، کھیل کے میدان کی گولائی شکل، بیلن کی شکل میں رولر، دائرے کی شکل میں فٹ بال وغیرہ کا استعمال تعلیمی وسائل کے طور پر ہونا چاہیے۔ اس لیے اسکول کی دیواریں، عمارت اور ڈھانچہ اس طرح تیار کریں کہ اس میں ریاضی کے تصورات واضح طور پر نظر آئیں۔

ریاضی کی تعلیم میں سابقہ معلومات اور تجربہ: سوامی وویکانند جی کے مطابق، " کوئی بھی علم باہر سے نہیں آتا، وہ ہی اندر ہوتا ہے، ہم کہتے ہیں کہ کوئی شخص کسی کو نہیں سکھاتا ہے۔ ہر شخص خود سیکھتا ہے۔ باہر کا استاد/شخص صرف تجاویز ہی دیتا ہے جس سے استاد کو سمجھنے یا سیکھنے کے لیے ترغیب ملتی ہے۔"

بچوں کا ریاضی سیکھنا اسکول آنے سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ بچے اپنا نقطہ نظر، تجربہ، زبان وغیرہ گھر سے لاتے ہیں۔ جیسے وہ کھیل کے میدان سے گھر تک کا فاصلہ جانتا ہے۔ وہ بس، اسکوٹر وغیرہ کے پہیے کا سائز، چاند اور روٹی کی شکلوں وغیرہ سے واقف ہوتا ہے۔ وہ وقت پر جاگتا ہے، وقت پر سوتا ہے، وقت پر اسکول جاتا ہے یعنی بچہ وقت سے واقف ہوتا ہے۔ بچہ کھیلتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے گروپ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر سکتا ہے۔ اسے چھوٹے، بڑے، موٹے، پتلے، کم، زیادہ، نفع، نقصان وغیرہ کا علم ہوتا ہے۔ وہ تصویر کو دیکھ کر چھوٹے، بڑے جانوروں کو پہچان سکتا ہے۔ وہ گھوڑے، گائے، کتے وغیرہ کی ٹانگوں اور گائے کے سینگوں کی تعداد بتا سکتا ہے۔ بچے کو دکان سے ٹافیاں، کیلے، مونگ پھلی وغیرہ لینے کا تجربہ بھی ہوتا ہے۔ بچے اس طرح کے بہت سے طاقتور تجربات اپنے ساتھ اسکول لاتے ہیں۔ ان کے پاس پہلے سے موجود علم کی دولت ہوتی ہے۔ ان کی معلومات کے سرمایے کا استعمال ہمیں ریاضی سیکھنے کے لیے کرنا چاہیے۔

ریاضی کی تعلیم کے دوران زندہ مثالیں پیش کرنا: ریاضی کو خوف سے پاک، بامعنی، مختصر، سادہ اور خوشگوار بنانے میں زندہ مثالیں بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ بچوں کے لیے مثالیں بہت ہی اہم ہوتی ہیں۔ یہ بچوں میں سوچ کی وسعت کو بڑھا دیتی ہیں اور بچوں کو بیرونی دنیا کے ساتھ تعامل کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ ہمیں کمرۂ جماعت میں بچوں کے ماحول سے متعلق ہی مثال استعمال کرنی چاہیے۔ بچوں کی درسی کتابوں میں ایسے سوالات اور مثالیں ہونی چاہئے جن میں مقامی علم اور روایتی مہارت شامل ہو۔ مثال کے طور پر دیہی طلباء کو کھیتوں، گودام، نہر کی چوڑائی، دریا، تالاب، درخت کی اونچائی، فٹ پاتھ، بیج، گنے کی اونچائی وغیرہ کی مثالیں دینی چاہئیے، جبکہ شہری ماحول کے بچوں کو پل، ہائی وے، سڑک، عمارت، میٹرو ٹرین کی رفتار، پارک کا سائز وغیرہ کی مثالیں دی جانی چاہئیے۔ جس کی وجہ سے ریاضی سے بچوں کو لگاو پیدا ہوگا۔

سرگرمیوں کے ذریعے پُر دلچسپ ریاضی سیکھنا: سوامی وویکانند کے مطابق، "اگر تعلیم کا مطلب صرف معلومات ہوتا تو لائبریریاں دنیا کے بہترین اولیاء (سنت) ہوتے اور انسائیکلوپیڈیا رشی بن جاتے۔" علم استعمال کے ذریعہ طاقت

بن جاتا ہے۔مختلف سرگرمیوں کے ذریعے ریاضی سیکھنے کے عمل کو آسان بنایا جاسکتا ہے۔ یہاں بچے کو کر کے سیکھنے (عملی کام) کا موقع ملتا ہے اور بچے کی سمجھ ریاضی میں بنتی ہے۔ ہمیں بچوں کی نظریاتی تعلیم کی بجائے عملی تعلیم پر زور دینا چاہیے، جس میں بچوں کو کر کے سیکھنے کا نظم ہونا چاہئے ۔اس کے لیے نصاب میں بہت سی سرگرمیاں شامل ہونی چاہئیے اور اسکول میں مقابلوں کا انعقاد کر کے بچوں کو کھیل کھیل میں ریاضی کے سیکھنے کے عمل کا حصہ بنانا ایک منفرد اور قابل ستائش کوشش ہوگی۔

کھیل کے ذریعے ریاضی کی تعلیم: فروبیل (Froebel) کے مطابق، "بچے کی خود عملی کھیل کے ذریعے فروغ پاتی ہے، جس سے شخصیت کی نشو ونما قدرتی طور پر ہوتی ہے۔" ابتدائی سطح پر بچوں کو کھیلوں کے ذریعہ سکھانا ایک بہترین طریقہ ہے۔ بچوں کی تعلیم اس ماحول میں بہترین ہوتی ہے، جب وہ تناؤ، خوف، اضطراب وغیرہ سے آزاد ہو کر اپنی دلچسپی کے مطابق آزادانہ طور پر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ استاد کمرۂ جماعت میں تعلیمی کھیل سیکھنے کی رفتار میں اضافہ کرتے ہیں۔ تمام بچے کھیلوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ بچے کھیلتے ہوئے اپنے دماغ، جسم اور جذبات کا استعمال کرتے ہیں۔ کھیلتے وقت بچوں میں، خود حوصلہ افزائی، جوش، توانائی، دلچسپی وغیرہ کا تعامل ہوتا ہے۔ ابتدائی سطح پر کھیلوں کے ذریعے، بچوں کو کم، زیادہ، تعداد، گننے، موازنہ کرنے، فرق دیکھنے، چھوٹا، بڑا کرنے، گھٹتی بڑھتی ترتیب اور حکمت عملی بنانے کا موقع ملتا ہے۔ کھیل کے ذریعے بچے اپنی دلچسپیوں، ضروریات، مہارتوں اور صلاحیتوں کے مطابق خود سیکھتے ہیں۔ اس لیے ابتدائی سطح پر بچوں کو ریاضی سے متعلقہ کھیلوں کے ذریعے تعلیم دی جانی چاہیے۔

نظموں کے ذریعے ریاضی کی تعلیم: نظم اپنی شاعری، تال اور دُھن وغیرہ کی وجہ سے بچوں کے ذہن کو موہ لیتی ہے اور پڑھنے میں بچوں کی دلچسپی میں اضافہ کرتی ہے۔ بچوں کو ابتدائی طور پر کسی بھی موضوع کو نظم کی شکل میں ڈھال کر سکھایا جانا چاہیے۔ اس کے ذریعے ریاضی کی تعلیم کو خوشگوار، تفریح آمیز، موثر، آسان اور دلچسپ بنایا جاسکتا ہے۔

ریاضی کی تعلیم میں آئی سی ٹی کا استعمال: آج تعلیم میں آئی سی ٹی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ریاضی کی تعلیم میں آئی سی ٹی کا استعمال کر کے ریاضی سیکھنا آسان بنایا جا سکتا ہے۔ آئی سی ٹی نے طلباء کو آزادی دی ہے کہ وہ اپنی سمجھ کو، تحریر سے، سن کر، دیکھ کر اور تجربہ کے ذریعہ جس طرح چاہیں اس کا اظہار کر سکتے ہیں ہیں۔ یہاں پر موضوع سے متعلق پی ڈی ایف، ویڈیو، آڈیو، کتاب اور ٹیوشن ہر عنوان پر دستیاب ہیں۔ کوئی بھی طالب علم کسی بھی وقت کوئی بھی لیکچر سن سکتا ہے۔ آج بیشتر طلباء کے پاس موبائل، اسمارٹ فون، لیپ ٹاپ وغیرہ ہیں۔ انہیں وسائل سمجھ کر ان کے ذریعہ تعلیم دی جائے۔

ان سب کے علاوہ، ریاضی کی تعلیم کو موثر بنانے کے لیے، اسکولوں میں عظیم ریاضی دانوں کی سوانح، جدو جہد اور ان کی خدمات کے بارے میں طلباء کو واقفیت کروائی جانی چاہیے۔ ریاضی کے تجربہ کار اساتذہ کے ریاضی پر لیکچرز ہونے چاہئیے اور اسکولوں میں ریاضی پر مضمون نویسی جیسے مقابلوں کا

اہتمام کیا جانا چاہیے۔ ہر اسکول میں ریاضی کی لیبارٹری بھی ہونی چاہیے جو جدید آلات اور سمعی بصری تعلیمی وسائل (Audio Visual Teaching Aids) سے لیس ہو۔ ریاضی میں، اساتذہ، ریاضی دان اور اسکالر اپنی تحقیق اور تجربے کی بنیاد پر ریاضی کی دلچسپ کتابیں تالیف کریں۔ جس میں نفسیات کے اصولوں کو مکمل طور ملحوظ رکھا جائے اور جو بچوں اور اساتذہ کو اپنی طرف راغب کرسکتی ہوں۔

اختتامیہ: مذکورہ بالا تفصیل کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ استاد کی صحیح سمت میں کی جانے والی کوششوں کے نتیجہ میں بچوں کو تناؤ سے پاک، نڈر، خوشگوار، اور ریاضی سیکھنے کا نتیجہ خیز ماحول دیا جاسکتا ہے۔ یصرف یہ ضروری ہے کہ بچے کی ذہنی کیفیت کو سمجھا جائے اور اس کی دلچسپی کو پرکھا جائے۔ اس کی سیکھنے کی صلاحیت کا مطالعہ کیا جانا چاہیے اور پھر اس کے مطابق آسان اور دلچسپ و مناسب طریقوں کو بروئے کار لایا جانا چاہیے، جو کہ عملیت کے ساتھ ساتھ تصورات پر مبنی ہوتا کہ بچہ جو کچھ سیکھے وہ اس کے ذہن میں نقش کر جائے۔ اور جس کا استعمال وہ اپنی مستقبل کی پیشہ ورانہ زندگی میں مناسب طور پر دباؤ سے پاک اور بے خوف ریاضی کے ساتھ کر سکے۔

☆☆☆

جہانگیر عالم (اسسٹنٹ پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)
ڈاکٹر علی حیدر (اسسٹنٹ پروفیسر، سی ٹی ای، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، اسنسول)

صرف ایک داؤ

ایک شخص کشتی لڑنے کے فن میں مشہور تھا، وہ تین سو ساٹھ داؤ پیچ جانتا تھا اور ہر روز ان میں سے ایک داؤ کے ساتھ کشتی لڑا کرتا۔ وہ اپنے ایک شاگرد پر بہت مہربان تھا۔ اس کو تین سو اُنسٹھ (359) داؤ سکھا دیئے صرف ایک اپنے پاس رکھا۔ وہ نوجوان کچھ عرصہ میں زبردست پہلوان بن گیا اور دور دور تک اس کی شہرت پھیل گئی۔ ملک بھر میں کسی پہلوان کو اس سے مقابلہ کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ایک دفعہ اس نوجوان نے اپنے طاقت کے زعم میں بادشاہ وقت سے کہا کہ استاد کو مجھ پر جو فوقیت حاصل ہے وہ اس کی بزرگی اور تربیت کے حق کی وجہ سے ہے ورنہ قوت اور فن میں اس سے کم نہیں ہوں۔ بادشاہ کو اس کی تعلّی پسند نہ آئی اور اس نے استاد اور شاگرد میں کشتی کرانے کا حکم دیدیا۔ وقت مقررہ پر کشتی شروع ہوئی۔ نوجوان مست ہاتھی کی طرح دنگل میں آیا۔ بوڑھا استاد سمجھ گیا کہ نوجوان طاقت کے زعم میں مجھ سے کشتی لڑنے آیا ہے لیکن وہ میرا وہ داؤ نہیں جانتا جو میں نے اس کو نہیں بتایا ہے۔ جیسے ہی شاگرد اس سے مقابلے کے لئے آگے بڑھا استاد نے اسے اپنے ہاتھوں سے سر پر اٹھایا اور زمین پر پٹخ دیا، ہر طرف واہ واہ کا شور مچ گیا، بادشاہ نے استاد کو انعام واکرام سے سرفراز کیا اور نوجوان کو لعن طعن کی کہ تو نے اپنے محسن استاد سے مقابلہ کیا۔ نوجوان نے کہا کہ بادشاہ سلامت استاد اپنے طاقت کی وجہ سے نہیں جیتے بلکہ انہوں نے یہ ایک داؤ مجھے نہیں بتایا تھا۔ اس حکایت سے ہمیں سبق ملتا ہے استاد استاد ہوتا ہے اس لئے کبھی استاد سے مقابلہ کی جرأت نہیں کرنی چاہیے۔

(ماخوذ از: حکایات سعدیؒ)

مضامین

تحریکِ جنگ آزادی سے متعلق اردو میں تاریخیں

تحریک جنگ آزادی ہندوستان کی تاریخ کا اہم ترین باب ہے۔اس موضوع پر اردو میں بے شمار تاریخیں لکھی گئیں جو تاریخ نگاری کے نقطۂ نظر سے اہمیت کی حامل ہیں۔۱۸ویں صدی سے ۱۹۴۷ء تک تحریک جنگ آزادی سے متعلق اردو میں مختلف موضوعات پر تاریخیں لکھی گئیں ان موضوعات میں انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ، تقسیم بنگال، سودیشی تحریک ،تحریک خلافت، جنگ عظیم ، رولٹ ایکٹ ،جلیاں والا باغ ، سائمن کمیشن، سوراجیہ، وہابی تحریک، آزاد ہندفوج اور مجاہدین آزادی پر بھی اردو میں تاریخیں لکھی گئیں ۔اس ضمن میں ابوالکلام' گاندھی جی' محمد علی جوہر' بال گنگا دھر تلک' لالہ لاج پت رائے' گوکھلے اور دیگر مجاہدین آزادی سے متعلق تاریخیں قابل مطالعہ ہیں۔ان تصانیف میں کچھ کتابیں مختصر اور کچھ بہت ضخیم ہیں۔اختصار کے پیش نظر میں نے چند اہم تصانیف کا ذکر کیا ہے۔اس طرح اس دوران لکھی گئیں ان تمام کتابوں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ۔اس مقالے میں ان کتب کا احاطہ کرنے کی حتی المقدور کوشش کی گئی ہے جو مختلف کتب خانوں میں دستیاب ہیں ۔اس لیے ممکن ہے کہ کچھ اہم کتابیں اس کوشش میں شامل نہ ہوں ۔میں نے بیشتر کتابوں کا مطالہ کرکے اس مقالے میں صرف ان تاریخوں کا ذکر کیا ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے اہم ہیں۔اس ضمن میں بعض اہم تاریخوں کا مفصل تعارف درج ذیل ہے۔

انڈین نیشنل کانگریس اور مسلمانانِ ہند' از: ملاعبدالقیوم: یہ کتاب ۱۹۰۶ء میں علی گڑھ سے شائع ہوئی جو ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور جنگ آزادی میں ان کی ایثار وقربانیوں اور خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے

بیداری ہند: کارنامۂ مہاتما گاندھی' از: لالہ متصدی لال ہندی: یہ کتاب ۱۹۲۷ء میں میرٹھ سے شائع ہوئی جو ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں مہاتما گاندھی کے ابتدائی حالات و واقعات کے علاوہ ان کے ذریعے چلائی گئی تحریکات ، عدم تعاون کی تحریک، سول نافرمانی کی تحریک وغیرہ کا تذکرہ بڑی شرح وبسط کے ساتھ کیا گیا ہے۔

آزادی کی جنگ' از: عبدالوحید خاں: یہ کتاب ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی۔اس میں مجاہدین آزادی کے ایثار وقربانیوں کا ذکر بڑی شرح وبسط کے ساتھ کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت ، مسلمانوں کا ایثار، محمد علی کی تقریر پارلیمنٹ میں، مسلم لیگ کی اہمیت، مکمل آزادی کا اعلان وغیرہ موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ' از: عبدالوحید خاں: یہ کتاب ۱۹۳۸ء میں لکھنؤ سے شائع ہوئی جو ۴۵۳ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں ۱۸۵۷ء کے بعد جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قربانیاں ور ملک کی مختلف سیاسی تحریکات کا

تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب دو حصّوں میں منقسم ہے۔ حصّہ اوّل میں پندرہ ابواب ہیں۔ ان ابواب میں جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں ۱۸۵۷ء کا غدر اور اس کے تباہ کن نتائج، سرسید کی سیاسی رہنمائی، جنگِ عظیم کا آغاز اور زمانہ جنگ کی سیاست ہند، تحریکِ خلافت کے آغاز تک کانگریس کی برطانیہ نواز پالیسی، ترک موالات کا آغاز۔ التوا تحریک کے بعد شدھی اور سنگھٹن، سائمن کمیشن کا بائیکاٹ، نہرو رپورٹ اور کانگریس کے منصوبے، گول میز کانفرنس وغیرہ اہم ہیں۔ حصّہ دوم دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی کمی، تحریکِ وطنیت، مسئلہ اقلیت اور کانگریس، آزاد ہندوستان میں آزاد اسلامی ریاست کا قیام، مسلم لیگ کی اہمیت، جمعتہ العلماء ہند کی پالیسی پر ایک نظر وغیرہ پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف و تالیف میں تاریخ کانگریس، تاریخ مہاراشٹر، اخبار ملاپ، مسلمانوں کا روشن مستقبل، مسلمانان ہند، مجموعہ لیکچر سرسیّد وغیرہ ماخذات سے استفادہ کیا ہے۔

مسلمانان ہند کی سیاست وطنی' از: محمد امین زبیری مارہروی: یہ کتاب ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی جو ۱۲ ابواب اور ۲۱۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۳۸ء تک کے ان سیاسی حالات و واقعات کا تاریخی بیان درج ہے۔ جو ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تحریک، مسلم لیگ کے قیام اور اس کی جدوجہد انتخابات جداگانہ اور کانگریس کے مذاکرات اور دیگر ضمنی امور سے متعلق ہیں۔

سیاست ملّیہ' از: محمد امین زبیری: یہ کتاب ۱۹۴۱ء میں آگرہ سے شائع ہوئی جو ۱۹ ابواب اور ۵۹۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مسلمانان ہند کی سیاسی تحریکات (۱۸۵۷ء تا آغاز ۱۹۴۱ء) کی مکمل و مفصل تاریخ درج ہے۔ اس کتاب میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۱ء تک جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان میں غدر ۱۸۵۷ء مسلمانوں سے متعصّبانہ انتقام، سرسید کی مدافعانہ جدوجہد، سرسید احمد خاں کی تحریک، کانگریس کی تاسیس اور اس کے مقاصد، بانی کانگریس کا نظریہ قومیت، تقسیم بنگال، آل انڈیا مسلم لیگ کی تاسیس، مسلم لیگ کا مسلک، جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کا آغاز، اجلاس مسلم لیگ ۱۹۱۵ء منعقدہ بمبئی، ہندو مسلم فسادات، تحریک خلافت کا اثر، ترک موالات کا خاتمہ، سائمن کمیشن، نہرو رپورٹ کی ترتیب و اشاعت، سول نافرمانی کی تحریک کانگریس اور لیگ میں مذاکرات، اقبال کا نظریۂ پاکستان، مسلم لیگ کا اجلاس لاہور ۱۹۴۰ء، کانگریس سے گاندھی کی سبکدوشی، کانگریس کا نظریہ قومیت اور ایک وفادار کانگریسی مسلمان کی علیحدگی وغیرہ پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ ہے جس میں مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن اور مردم شماری درج ہے۔

آزادی کی بھینٹ' از: بی۔ کے نارائن: یہ کتاب ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہدِ آزادی کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مکمل تاریخ آزاد ہند فوج' از: اسرار احمد آزاد: یہ کتاب سترہ ابواب اور ۵۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں غدر ۱۸۵۷ء

مضامین

سے لے کر تمام انقلابی تحریکات کا تذکرہ شامل ہے۔مؤلف نے اس کتاب میں جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ان میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ،گذشتہ اور موجودہ صدی کی تمام انقلابی تحریکات ،انقلابی تحریکات میں مسلمانوں کی شرکت ، پنجاب کے سکھوں اور سکھ تارکانِ وطن کی انقلابی جدوجہد،غدر پارٹی اور ہندوستانی انقلاب پسندوں کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس میں سبھاش چندر بوس کی ان تقریروں اور عارضی حکومتِ ہند کے ان فرامین اور اعلانات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔جنھوں نے آزاد ہندفوج نیز حکومت آزاد ہند کو زندہ حقیقت بنایا دیا پھر اس میں اس فوج کی لڑائیوں اور اس کے انتظامی شعبوں کے حال کے علاوہ کپتان شاہنواز، کپتان پریم سہگل اور لیفٹننٹ گورنر بخش سنگھ ڈھلن کے مقدمے کے حالات بھی درج ہیں۔

تحریک ۱۹۴۲ء کی داستان' از : شری دھرم پال :یہ کتاب ۱۵۵صفحات اور نو ابواب پر مشتمل ہے۔ان ابواب میں جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ان میں آغاز جدوجہد ، ہندوستان چھوڑ وتحریک ،آزاد ہند فوج،مسلم لیگ ،کمیونسٹ وغیرہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کتاب میں خاص طور سے ہندوستان چھوڑ وتحریک پر فوکس کیا گیا ہے ۔اور اسے ہندوستان کی دوسری جنگ آزادی کی مکمل تاریخ بتایا ہے۔اس کتاب کا اشاعت سن ندارد ہے۔

سی۔پی میں کانگریس راج' از اسرار احمد کریوی: یہ کتاب ۱۹۴۱ء میں ناگپور سے شائع ہوئی جو ۳۰۰صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں سی۔پی میں کانگریسی حکومت کے قیام (۱۹۳۵ء تا۱۹۳۹ء) کے دوران مسلمانوں کے ساتھ حکومت کے جانبدارانہ رویے کی روداد درج ہے۔اس کتاب میں صرف صوبہ متوسط وبرار کے واقعات درج ہیں۔

مسلم لیگ کیوں' از: ذاکرحسین فاروقی : یہ کتاب ۱۹۴۷ء میں بمبئ سے شائع ہوئی۔جو۲۶۳صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں مسلم لیگ کی تاریخ ،نظریہ پاکستان کا سیاسی و تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تقسیم ہند' از : عبدالوحیدخاں: عبدالوحیدکی تالیف تقسیم ہند ۱۹۵۶ء میں نقوش پریس لاہور سے شائع ہوئی جو ۴۰۸ صفحات پر مبنی ہے۔اس کتاب میں ابوالکلام آزاد کی خودنوشت تالیف ''انڈیا ونس فریڈم'' کا جواب تاریخی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔یہ کتاب مولانا آزاد کی سیاسی زندگی کے پہلو پر روشنی ڈالتی ہے۔ہندوستان کی تقسیم سے متعلق تاریخوں میں یہ کتاب اہمیت کی حامل ہے۔

''آزادی ہند'' از: رئیس احمد جعفری: تحریک آزادی سے متعلق مآخذ میں ''آزادی ہند''اہم ترین تصنیف ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۹ء میں مقبول اکیڈمی، لاہور سے شائع ہوئی، جو ۵۰۰صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ابوالکلام کی خودنوشت تصنیف انڈیا وِنس فریڈم پر تبصرہ شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔''آزادی ہند'' ابوالکلام کی اہم ترین خودنوشت تالیف انڈیا وِنس فریڈم کا اردو ترجمہ ہے۔جس کے مترجم رئیس احمد جعفری ہیں۔ ''آزادی ہند'' میں رئیس احمد جعفری

نے"India Wins Freedom" کے مباحث کو اردو میں ترجمہ کرکے اپنے مشاہدات ومعلومات کی روشنی میں گفتگو کی ہے۔ اس کتاب میں مولانا ابوالکلام کے ذاتی حالات وسوانح سے متعلق معلومات خود مولانا آزاد کا لکھا ہوا مفصل تذکرہ موجود ہے۔اس کتاب میں ابوالکلام آزاد کے سیاسی مباحث کا تذکرہ ملتا ہے، جوکہ تاریخی نقطۂ نظر سے اہمیت کا حامل ہے۔رئیس احمد جعفری نے واقعات ومباحث پر الگ الگ عنوانات کو یکجا کرکے ان کی تشریح کی ہے۔

آزادی ہند از : مولانا ابوالکلام آزاد، مرتبہ ہمایوں کبیر: آزادی ہند مولانا ابوالکلام آزاد کی انڈیا ونس فریڈم کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ کتاب مکتبہ جمال لاہور سے ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی جسے ہمایوں کبیر نے مرتب کیا ہے۔اس کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد کی نہ صرف ابتدائی زندگی کے بارے میں معلومات فراہم ہوئی ہیں بلکہ کانگریس کے ساتھ منسلک ہونے کے بعد کی جدوجہد کی مکمل عکاسی کی گئی ہے۔آزادی ہند پر یہ کتاب اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔

جیل خانہ کی کہانی مرتبہ لال چند فلک: یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں شائع ہوئی،اس کتاب میں جیل خانے کے حالات وواقعات کا تذکرہ قیدیوں کی زبانی کیا گیا ہے۔جیل خانہ میں ان قیدیوں کو جن مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔اس کتاب کے مرتب لال چند فلک نے اپنی شاعری کے ذریعہ عکاسی کی دیباچہ میں ان قیدیوں کے حالات کے بارے میں اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''ہر قسم کے مجرموں سے پولیٹیکل قیدی کا خطرناک اور معزز ہونا اس لیے کہ وہ ایسے بہادر ہوتے ہیں جنھیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں ڈرا سکتی ہے۔حاکم وقت کے خلاف زبان قلم اور ضرورت ہو تو ہاتھ پیر سے بھی مقابلہ کرتے ہیں جب وہ کوئی ظلم ہوتا دیکھتے ہیں تو وہ رہ نہیں سکتے جب کوئی کمزور ستایا جاتا ہے تو ان کو تکلیف ہوتی ہے اور اکثر ایسے ہی لوگ ظالموں کے ظلم زبردستوں کی زبردستی کا خاتمہ کرتے ہیں پس ان سے زیادہ اور کون خطرناک ہوسکتا ہے۔معزز اس لیے ہیں کہ وہ ہرگز کسی جرم کے مجرم نہیں ہوتے ان پر جو کچھ الزام لگایا جاتا ہے، سراسر بہتان ہوتا ہے۔وہ یہی کرتے ہیں جو ایک ایمان دار خداترس محبِّ قوم کیا کرتا ہے اور کرنا فرض جانتا ہے۔''

جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار از: ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی: یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں ترقی اردو بیورو، دہلی سے شائع ہوئی۔اس کتاب میں تحریک مجاہدین آزادی کے سماجی، سیاسی افکار پر روشنی ڈالی گئی۔اس ضمن میں راجہ رام موہن رائے، سرسید، ڈاکٹر مسز اینی بسنت اور بھگوان داس کے سیاسی وسماجی خیالات، بال گنگا دھر تلک کا سیاسی اور سماجی فلسفہ، وپن چند پال اور لالہ لاج پت رائے، گوپال کرشن گھوکھلے کے سیاسی نظریات، مہاتما گاندھی محمد علی اور ابوالکلام آزادی کے سیاسی فلسفہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

آزادی کی منزل تک از : جواہرلعل نہرو، مرتبہ پریم چند: یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی۔ اس تصنیف میں جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے اس ضمن میں برطانوی

شہنشاہیت کو ہندوستان سے چلے جانے کا نوٹس ہندوستان کی آزادی کے لیے شہنشاہیت ختم کرنی پڑے گی، ہم پر کسی کو حکومت کا اختیار نہیں، غلامی، غربت، پاکستان اور انگریزی راج سے چھٹکارا ۱۹۴۲ء کو فراموش کرنا دشوار ہے، برطانوی حکومت زیادہ دیر تک ٹھہر نہیں سکتی، آزادی کی منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ برطانیہ ہندوستان کو آزاد کرنے پر مجبور ہے۔ ہندوستان میں بغاوت کے شعلے، آزادی کے ڈرامے کا آخری ایکٹ وغیرہ حقائق کی عکاسی کی ہے۔

تحریک آزادی ہند میں مسلم علماء عوام کا کردار' از : محمد سلمان منصور پوری: اس کتاب میں تحریک جنگ آزادی ہند میں مسلم علماء کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح جنگ آزادی میں مسلم علماء نے بڑا موثر کردار ادا کیا ہے۔ اس ضمن جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے ان میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ' سید احمد رائے بریلوی' ملک کے دیگر حصوں سے سید صاحب کا رابطہ، سید صاحب کے اخلاق و اوصاف، سید صاحب کی شہادت کے بعد علماء صادق پور کی قربانیاں، مولانا ولایت علی صاحب کی گرفتاری، مولانا عنایت کی امارت، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی پر اثر تاریخی تقریر، جمعیۃ علماء ہند کا قیام، جامعہ ملیہ کا قیام، جمعیۃ علماء کا دوسرا اجلاس عام، تحریک عدم تعاون، نہرو رپورٹ، تحریک نمک سازی، تحریک سول نا فرمانی، مسلم لیگ اور جمعیۃ علماء میں سمجھوتہ کی کوشش، مسلم لیگ اور کانگریس کی مہر تصدیق، ہندوستان چھوڑو تحریک وغیرہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تحریک آزادی ہند اور مسلمان' از : محمد احمد صدیقی: ۱۹۹۸ء میں گورکھپور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں تحریک آزادی میں مسلمانانِ ہند کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں ۱۵۸۵ء سے ۱۹۴۷ء تک مسلمانانِ ہند کی قربانیوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں تحریک حریت حضرت مجدد الف ثانی سرہندی' شاہ ولی اللہ تحریک، ۱۸۵۷ء کا خونیں انقلاب، تقسیم بنگال اور مسلمان، مسلم لیگ کا قیام، ریشمی رومال تحریک، اردو صحافت اور تحریک آزادی، رولٹ ایکٹ، حادثہ جلیانوالہ باغ ۱۹۱۹ء، ۱۹۱۹ء کے مسلم شہدا، خلافت تحریک، نان کوآپریشن تحریک، چوری چورا کا واقعہ وغیرہ تحریک آزادی سے متعلق واقعات کی عکاسی کی گئی ہے۔

تحریک آزادی ہند اور مسلمان' از : سید ابوالاعلی مودودی، مرتبہ خورشید احمد: اس کتاب میں مسلمانانِ ہند کی تاریخ پر اسلامی نقطۂ نظر سے تبصرہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں آزادی کی تحریک میں مسلمانان ہند کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی۔ ان میں قومی تحریک، کانگریس، متحدہ قومی تحریک اور مسلمان، کانگریس اور ہندو مہاسبھا، کانگریس اور انگریزی حکومت جنگ آزادی کی نوعیت، کانگریس اور مسلمان وغیرہ جیسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تحریک آزادی ہند اور مشائخ و علماء کا کردار' از : مولانا محمد شہزاد قادری ترابی: اس کتاب میں تحریک آزادی ہند میں مشائخ و

علماء کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کی ابتداء میں انتساب ہے جوان مجاہدین اور علماء کے نام خصوصاً علامہ کفایت علی کافی، علامہ فضل حق خیرآبادی، امام احمد رضا فاضل بریلی اور آپ کے تلامذہ اور ان تمام مجاہدین تحریک آزادی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کے نام ہے۔ یہ کتاب تحریک آزادی سے متعلق تصانیف میں اہمیت کی حامل ہے۔

جنگ آزادی اور مسلمان از: انیس چشتی: اس تصنیف میں جنوبی ہندوستان کی ایک تاریخ ساز تحریک آزادی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مؤلف نے تحریک جنگ آزادی سے متعلق جن موضوعات پر روشنی ڈالی ہے ان میں جنگ آزادی میں مسلم کردار، شہدا و مجاہدین آزادی ۱۸۵۷ء اور جلیاں والا باغ کا سانحہ، کالا پانی، مولانا جعفر تھانیسری، جمعیۃ العلماء، خلافت کمیٹی وغیرہ موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔

مجاہدین آزادی سے متعلق تصانیف: ذیل میں چند اہم مجاہدین آزادی سے متعلق تصانیف کا تعارف درج ہے۔

ابوالکلام آزاد ایک شخصیت ایک مطالعہ از: ابوسلمان شاہجہاں پوری: یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں دین محمدی پریس، لاہور سے شائع ہوئی، جو ۴۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر مرتب اور مشاہیر، محققین ہندوپاک کے تقریباً پندرہ مضامین کا مجموعہ منسلک ہے۔

امام الہند (تعمیر افکار) از: ابوسلمان شاہجہاں پوری: اس کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ابتدائی ۲۴ سالہ زندگی کے حالات اور ان کے اساتذہ کا تذکرہ شامل ہے۔ یہ کتاب ۱۹۶۲ء میں انجمن پریس، کراچی سے شائع ہوئی۔ یہ ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد' از: ابوسعید: یہ کتاب ۱۹۴۶ء میں لاہور سے شائع ہوئی، جو ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہے اس میں مولانا ابوالکلام آزاد کے علمی، مذہبی اور سیاسی شخصیت کے چند اہم پہلوؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

بھگوان تلک از: آنند کشور مہتا: یہ کتاب ۱۹۲۱ء پنجابی پریس، لاہور سے شائع ہوئی، جو ۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ہندوستان کے مشہور و معروف مجاہدین آزادی بال گنگا دھر تلک کے حالات درج ہیں۔

بھارت سپوت از: سید امتیاز علی تاج: مہاتما گاندھی کی سوانح عمری پر مشتمل یہ کتاب ۱۹۱۹ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ کتاب کی ابتداء میں تمہیدی الفاظ موتی لعل نہرو نے قلم بند کیے ہیں۔ ذیل میں تمہیدی الفاظ بطور نمونہ درج ہیں۔ میں نے اس کتاب پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔ اس میں شک نہیں۔ مؤلف نے اپنا مطالب نہایت سلیس اور پراثر الفاظ میں ادا کیا ہے۔ مہاتما گاندھی کے اوصاف محتاج بیان نہیں۔ مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی کہ ایک مسلمان نوجوان نے ایک ہندو بزرگ قوم کی سوانح عمری مرتب کی ہے۔ جو ایک طرف تو نوجوان موصوف کی نیک دلی اور سعادت مندی کی اور دوسری طرف ہندو مسلمانوں کے سچے اتحاد کی نشانی ہے۔ مؤلف نے وطن کی خدمت کی ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ اہل وطن اس کی قدر کریں گے۔

دستخط، پنڈت موتی لعل نہرو

مضامین

گاندھی نامہ' از : خواجہ حسن نظامی: گاندھی نامہ خواجہ حسن نظامی کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین اخبارات اور رسائل میں مہاتما گاندھی کی نسبت شائع ہوئے تھے یا جن رسائل میں کچھ ذکر بھی مہاتما گاندھی سے متعلق پایا گیا تو ان کو یکجا کردیا گیا۔ ان مضامین کی حالت بالکل جداگانہ معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ مضامین الگ الگ اوقات میں لکھے گئے تھے۔ غالباً تین چار سال کے مضامین اس مجموعے میں شامل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود سبھی مضامین کی کیفیت متحد ہے۔اس کی کتاب کی اشاعت ۱۹۲۲ء میں ہوئی۔

باپو کے قدموں میں' از: ڈاکٹر رجندر پرشاد، مترجم محمد عبدالغفار: یہ کتاب ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی جو ڈاکٹر راجندر پرشاد کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔اس کتاب کی ضخامت ۲۲۷ صفحات ہیں۔ اس میں گاندھی جی کے حالاتِ زندگی کا تذکرہ بڑی شرح وبسط کے ساتھ کیا ہے اور تحریک آزادی میں گاندھی جی کے خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس ضمن میں چمپارن کے کسانوں پر انگریزوں کی سختیاں چمپارن کے متعلق گاندھی جی کی لفٹینیٹ گورنر بہار سے ملاقات، چمپارن کے تحقیقاتی کمشن کا قیام، ہندی پرچار، ۱۹۱۹ء ، ہندوستان اور کالا قانون، ۱۹۲۰ء کا نیا انتخاب اور ناگپور کانگریس کا فیصلہ، علی برادران کے ساتھ مہاتما گاندھی کا دورہ، نمک کے قانون کو توڑنا اور مہاتما گاندھی کی ڈانڈی کو روانگی، بہار میں نمک کے قانون کے خلاف ستیہ گرہ، بھاگلپور کی ستیہ گرہ وغیرہ موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔اس کتاب کے مطالعہ سے گاندھی جی کی تحریک آزادی میں اہم ترین کردار پر روشنی پڑتی ہے۔

محمد علی جوہر از: محمد دین ادیب: یہ کتاب ۱۹۳۱ء میں لاہور سے شائع ہوئی، جو ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں محمد علی جوہر کی وفات پر ملک کے اخبارات ورسائل کے تعزیتی اداریے اور شعراء اکرام کا خراجِ عقیدت پر روشنی ڈالی گئی ہے کتاب کے شروع میں مولانا کی خودنوشت سوانح عمری اور کتاب کے آخر میں جوہر کا کچھ کلام بھی شامل کیا گیا ہے۔

حالاتِ برادران از : خواجہ سید نقشبندی: یہ کتاب ۱۹۲۱ء میں حمیدیہ پریس دہلی سے شائع ہوئی، جو ۶۰ صفحات پر مبنی ہے اس میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کے حالاتِ زندگی اور سیاسی خدمات کا تذکرہ بڑی شرح وبسط کے ساتھ کیا گیا ہے۔

سیرتِ محمد علی' از: رئیس احمد جعفری: یہ کتاب مولانا محمد علی جوہر کی سیرت وسوانح حیات پر مشتمل ہے، جو ۱۹۳۲ء میں مکتبہ جامعہ اسلامیہ، نئی دہلی سے شائع ہوئی۔اس کتاب کی ضخامت ۵۴۴ صفحات ہیں۔اس تصنیف میں تحریک آزادی میں محمد علی جوہر کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

لالہ لاج پت رائے از: پنڈی داس: لالہ لاج پت رائے کے حالاتِ زندگی پر مشتمل پنڈی داس کی کتاب ''لاج پت'' لاہور سے شائع ہوئی، جو ۱۰۲ صفحات پر مبنی ہے۔ اس میں ہندوستان کی جنگ آزادی میں لالہ لاج پت رائے کی قربانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

لالہ لاج پت از: کشور جی، مہتہ آنند: یہ کتاب ۱۹۲۲ء میں لاہور سے شائع ہوئی، جو ۱۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں

سیاسی لیڈر لالہ لاج پت رائے کی سوانح حیات درج ہے جو کہ لالہ لاج پت رائے کی زندگی ہر پہلو کی عکاسی کی گئی ہے۔

خیالاتِ گوکھلے' از: لال چند فلک: یہ کتاب ۱۹۶۵ء میں لاہور سے شائع ہوئی اس کتاب میں گوکھلے کی سوانح عمری کے ساتھ ساتھ ان کے اصولوں اور خیالات وعقیدوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تحریک آزادی میں گوکھلے کی خدمات اوران کی قربانیوں کا تذکرہ بڑی شرح وبسط کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف وتالیف میں مختلف رسالا جات، کانگریس کی رپورٹوں، ٹائمز آف انڈیا بنگالی اخبارات سے ترجمہ وغیرہ مآخذات سے اقتباس اخذ کیے گئے ہیں۔

حالات گوکھلے' از: مظفر حسن خاں: یہ کتاب گوپال کرشن گوکھلے کی زندگی کے حالات پر مشتمل ہے اس کی اشاعت ۱۹۱۹ء میں حیدرآباد دکن سے ہوئی جو ۱۵۶ صفحات پرمبنی ہے۔

اس طرح تحریک جنگ آزادی پر لکھی گئیں ان تاریخوں کے مطالعے سے نہ صرف جنگ آزادی سے متعلق تحریکات کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہیں بلکہ مجاہدین آزادی کی خدمات اوران کی قربانیوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تاریخیں اردو تاریخ نگاری کے ارتقاء میں اضافے کا باعث ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر شہناز بیگم، اسسٹنٹ پروفیسر، (دہلی یونیورسٹی)
ایڈریس: 3234، کوچہ پنڈت،
لال کنواں، دہلی۔ 110006
موبائل نمبر: 9899730241

مضمون نگاران سے ایک درخواست

مضامین صاف' خوش خط اور صفحہ کے ایک جانب لکھ کر روانہ کریں ۔ اگر Inpage میں ٹائپ کروارہے ہوں تو اس کی Soft Copy قومی زبان کے ای میل پر روانہ فرمائیں۔ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا صحیح نام جو بنک اکاؤنٹ میں درج ہے ضرور لکھیں اور بنک پاس بک کی کاپی' اپنا مکمل پتہ معہ پن کوڈ نمبر روانہ کریں۔

ادارہ قومی زبان

خوشبودار باتیں

☆ زیادہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔

☆ دوسروں کے آنسوؤں کو زمین پر گرنے سے پہلے اپنے دامن میں جذب کرلینا انسانیت کی معراج ہے۔

☆ نیک بننے کی کوشش کرو جیسے حسین بننے کی کوشش کرتے ہو۔

☆ اعتماد وہ شیشہ ہے جو ایک بار ٹوٹ جائے تو دوبارہ نہیں بنتا۔

☆ جو یہ کہے کہ اس کی بات سچی ہے تو اس کی ہر بات جھوٹ ہوگی۔

مضامین

ہندوستان میں مساوی مواقع کمیشن کی مطابقت: ایک تجزیہ

تمہید: آج کی دنیا مطلوبہ احداف کی تکمیل کے لیے خواہشات اور چنوتیوں سے بھری پڑی ہے۔ احداف کو سماجی طور پر منظور کیا جاتا ہے جبکہ ادارہ جاتی طریقہ کار تقریباً تمام افراد کو پلیٹ فارم اور ذرائع فراہم کرتا ہے۔ لیکن یہ کسی بھی معاشرے میں عام نہیں ہے۔ وسائل کی دستیابی کبھی بھی کسی معاشرے میں یکساں طور پر تقسیم نہیں کی جاسکتی ہے۔ جب تک ایک مناسب پالسی اور منصوبہ بندی اچھی طرح سے تیار نہ کی جائے۔ مساوی مواقع ایک وضاحتی اصطلاح ہے جس کا مقصد ایک مخصوص سماجی قانونی ماحول فراہم کرنا ہے۔ جہاں معاشرے کے ہر طبقے کو مواقع کے مناسب مساوی اشتراک کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اس قسم کی پالسی کے ذریعے ریاست روزگار، بینکنگ، بھرتی کے عمل، تعلیم، صحت اور شہری زندگی کے دیگر تمام شعبوں میں انصاف اور غیر جانب داری کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کو اپنانے کی کوشش کرتی ہے۔

ریاست کا بنیادی ہدف کسی کے پس منظر، یعنی نسل، رنگ، جنس وغیرہ کی بنیاد پر کئے جانے والے تمام قسم کے امتیازات کو ختم کرنا ہے۔ مساوات اس وقت موجود ہوتی ہے جب یکساں صلاحیتوں کے حامل افراد کو یکساں کام کرنے کے بعد یکساں نتائج تک رسائی حاصل ہوتی ہیں۔ لہٰذا مساوی مواقع اور نتائج کے مساوات کو اکثر متضاد نظریے کے بجائے تکمیلی تصورات کے طور پر دیکھا جانا ہے۔

تعریف: عدم امتیاز کا اصول جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ تعلیم، روزگار، ترقی، فوائد اور وسائل کی تقسیم اور دیگر شعبوں میں مواقع تمام شہریوں کو ان کی عمر، نسل، جنس، مذہب، سیاسی وابستگی، نسلی اصل یا کسی سے قطع نظر آزادانہ طور پر دستیاب ہونے چاہئے۔

مساوی مواقع کیا ہیں؟ ہر ایک موقع ہر کسی کے لیے یکساں طور پر دستیاب ہو، قطع نظر اس کی عمر، نسل، جنس، مذہب، سیاسی وابستگی، نسلی تعلق اور کسی انفرادی یا گروہ کی خصوصیت، قابلیت، کارکردگی اور اہلیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ عدم امتیاز کا بہترین اصول ہے۔ یہ تصور پختہ یقین رکھتا ہے کہ تعلیم روزگار وترقی کے امکانات کے ساتھ ساتھ فوائد اور وسائل ہر شہری کے لئے کھلے عدم دستیاب ہونے چاہیے۔

جواہر لعل نہرو نے اپنی کتاب ''دی ڈسکوری آف انڈیا'' میں ملک کے تمام گروہوں کو یکساں مواقع فراہم کرنے کی اہمیت کے بارے میں بات کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں ہندوستان میں مساوات کا مقصد رکھنا چاہیے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر شخص جسمانی یا ذہنی یا روحانی طور پر برابر ہے یا ایسا بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ سب کے لیے یکساں مواقع اور کوئی سیاسی، معاشی یا سماجی رکاوٹیں نہ ہو۔ اس کا مطلب اس حقیقت کا ادراک ہے کہ کسی بھی گروہ کی پسماندگی اس میں موروثی ناکامی کی وجہ سے نہیں ہے۔

مضامین

بلکہ بنیادی طور پر مواقع کی کمی اور دوسرے گروہوں کی طرف سے طویل دباؤ ہے۔

امتیاز اور مساوات کا نہ ہونا: یکساں اور مصنفانہ برتاؤ کا مطلب یہ ہے کہ سب کے ساتھ یکساں مواقع ہوں اور آپ کی اپنی خوبیوں اور صلاحیتوں کی بنیاد پر ایک فرد کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے تاکہ وہ اکثریت کی طرح عزت حاصل کر سکیں۔ یہ تعصب، تنگ نظری اور دقیانوسی تصورات سے آزاد رکھنا بھی ہے۔ باہم ہندوستان کے معاملے میں قبائلی اور مسلمان ابھی بھی مساوی مواقع اور مصنفانہ سلوک کو حاصل کرنے سے محروم ہیں۔

امتیازی سلوک سے مراد عام طور پر لوگوں کے دوسرے گروہوں کے خلاف لوگوں کے کم سازگار عمل یا عقائد کو ظاہر کرنا ہے۔ یہ وہ تعصب لوگوں یا گروہوں کے دماغ کی اختراع ہے۔ کوئی بھی براہ راست یا بالواسطہ امتیازی سلوک کا شکار ہوسکتا ہے۔ براہ راست امتیازی سلوک ہوتا ہے۔ اگر کسی کے ساتھ دوسرے کے مقابلے میں کم موافق سلوک کیا جاتا ہے تو تقابلی صورت حال میں غیر تبدیل شدہ خصلتوں کی بنیاد پر باہم یا زیادہ لطیف شکلوں میں ہوتا ہے۔ بالواسطہ امتیاز اکثر اقلیتوں اور باریکیین بدن کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ غیر مادی ہے لیکن براہ راست امتیاز سے کم نقصان نہیں پہنچایا۔ اگر کوئی بظاہر غیر جانبدار فراہمی قواعد عمل کسی گروہ یا لوگوں کو مخصوص موقع سے نقصان پہنچاتا ہے۔ اگر کوئی بظاہر غیر جانبدار فراہمی قواعد، عمل یا کسی گروہ یا لوگوں کو مخصوص موقع سے نقصان پہنچاتا ہے تو اسے بالواسطہ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ یہاں ایک کے قوانین بھی اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ کسی کو ایسی ضرورت پوری کرنی چاہیے جس کا خود اس شخص سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اس قسم کے امتیازی سلوک شکار کی بہت واضح شکل ہیں اور یہ کہیں بھی اور کسی کے ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔ تعلیم، بینک، قرض، روزگار، سامان اور خدمات اور ہاؤسنگ یا عوامی اجتماع یا عوامی جگہ جیسے شعبوں میں امتیازی سلوک کے بڑے شعبوں کے طور پر درج کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام قسم کے غیر انسانی یا ذیلی انسانی طریقوں سے بچنے کے لئے Equal Oppotunity Commission (EOC) کی ضرورت کو سب سے زیادہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ مساوی مواقع، کمیشن (EOC) کے لیے تاریکیین وطن کے حق میں کئی مثبت اقدامات کی سفارش کر سکتا ہے۔ اسے ایک ریگولیٹری ادارے کے طور پر مثبت سرگرمی کے نام سے جانا جاتا ہے جس کا مقصد تاریخی طور پر غیر غالب سماجی و اقتصادی حصوں عام طور پر اقلیتیں، خواتین، مہاجرین، مہاجر کی حالت کو بہتر بنانا ہے۔ یہ مطلوبہ پالسیوں اور تقرر کے پروگراموں کے ذریعے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہاں معاشرے کے امتیازی یا پسماندہ طبقات کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جاتا ہے۔

مساوی مواقع کا کمیشن ... مفہوم: مساوی مواقع کمیشن ایک قانونی ادارہ یا کمیشن ہے۔ جو خاص طور پر اقلیتوں کے ساتھ کیے گئے کسی بھی نوعیت کے امتیازی سلوک کے معاملات سے نمٹتا ہے۔ کیمبرج کی شائع کردہ لغت کے لحاظ سے اس

اصطلاح کا مفہوم یہ ہے ''سب لوگوں کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھنے کا اصول، کسی شخص کی جنس، نسل، مذہب وغیرہ سے متاثر ہوئے بغیر'' بنیادی طور پر اصطلاح مساوات / برابری خود اس مفہوم کو ظاہر کرتی ہے یعنی ''یکساں حقوق یا سلوک جو امتیاز یعنی تعصب یا نقصان سے مبرّا ہو'' لفظ موقع کا مفہوم یہ ہے۔ ایسے حالات جو کچھ کرنے کو ممکن بناتے ہیں۔'' اس لیے مساوی موقع، ایک پالیسی ہے جس میں موافق ماحول اور صحیح وقت پر معاشرے کے نقصان زدہ (disadvantaged) اور نظرانداز کیے گئے (marginalised) طبقات، مساوی مواقع حاصل کرتے ہیں۔

مساوی مواقع کے کمیشن کا تصور: مساوی مواقع کمیشن مساوات کے لیے اور کام کے لئے برابر حقوق کے لیے کام کرتا ہے یہ امتیاز یعنی تعصب کو ختم کرنے کے لیے کام کرتا ہے۔ نابرابری یعنی عدم مساوات کو کم کرتا ہے۔ حقوق انسانی کی حفاظت کرتا ہے اور اس بات کا تیقن دلاتا ہے کہ معاشرے کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا ہر ایک کے لئے مساوی مواقع ہیں۔ یہ کمیشن، قوانین وضوابط کی عمل آوری یعنی نفاذ میں باقاعدگی پیدا کرنے والے ادارہ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔

وہ کسی بھی نوعیت کے تعصب (bias) اور یک طرفہ پاسداری (prejudice) کے واقعات نمٹتا ہے جو کسی گروہ کے ساتھ روا رکھے جاتے ہیں چاہے وہ معاشرتی ہوں کہ مذہبی، ذات سے متعلق ہوں یا کسی اور طرح کے ہوں، مساوی موقع کمیشن تعلیم، روزگار، رہائش، طبی نگہداشت اور ترقیاتی اسکیمات تک رسائی کے سارے معاملات پر نظر رکھتا ہے۔ مساوی مواقع کمیشن کا اہم مقصد، معاشرتی تنوع کو فروغ دینا اور تعصب کے اُن واقعات پر نظر رکھنا ہے جو نسل، جنس، مذہب وغیرہ کی بنیاد پر اقلیتی اور مہاجر طبقات کو پیش آتے ہیں تاکہ انہیں حکومت اور خانگی اداروں کی جانب سے فراہم کی جانے والی خدمات اور سہولتوں میں برابر کا حصہ مل سکے۔

تنوع کا اشاریہ: معاشرتی تنوع کی پیمائش کرنے کے لئے تنوع کا اشاریہ مدون کیا گیا ہے تاکہ اس بات کا جائزہ لیا جاسکے کہ آبادی نسلی اور نسبی اعتبار سے کتنی متنوع ہے۔ مساوی مواقع کے کمیشن کی کارکردگی کو موثر انداز سے چلانے کے لیے حکومتوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ تنوع کا اشاریہ مدون کریں اور دیکھیں کہ کس بہترین انداز سے اس کو نافذ کیا جاسکتا ہے۔ ریاست میں کسی بھی ادارہ کو اُس کی ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے جانچ کر کے تنوع کی درجہ بندی کی جائے گی۔ کئی تحقیقی مطالعات نے یہ سفارش کی کہ تنوع کا اشاریہ ریاست کے ہر ادارہ پر لاگو کیا جائے۔ تنوع کا اشاریہ غیر مذہبی طریقے سے عمل کرتا ہے اور متاثر ہونے والے سارے طبقات کو یہ تیقن دیتا ہے کہ مختلف شعبوں میں اُن کی نمائندگی اور ان کی آبادی کے تناسب سے ہوں گی اور یہ عمل موجودہ اسکیم کو چھیڑے بغیر نافذ کی جائے گی۔

ایک ادارے کی حیثیت سے مساوی مواقع کمیشن نے یوروپی

ممالک اورامریکہ میں قابل لحاظ کامیابی حاصل کی ہے۔مساوی مواقع کمیشن کوجمہوریت کے اساسی اقدار کے برقرار رکھنے کے لیے مناسب طریق کار کی ضرورت ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ پسماندہ طبقات کے ساتھ امتیازی سلوک کرنا قانوناً واجرم ہے۔مساوی مواقع کمیشن سہولت کارایک نگراں کارادارہ کی طرح کام کرتا ہے۔ یہ حکومت کونئی پالیسیوں کی تدوین میں مدد دیتا ہے۔مساوی مواقع کمیشن مسلسل اس بات کا جائزہ لیتا رہتاہیکہ جوقوانین اُس کے لئے وضع کیے گئے ہیں اُن پر نیک نیتی سے عمل ہورہا ہے یانہیں، اگرکسی قسم کے امتیازی سلوک کی اطلاع دی جائے تو یہ فوراً مناسب کارروائی کرتا ہے۔یوروپ کی ہدایات The Directives of the Year 2000 کے مطابق اس کمیشن کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ یہ خاطی فرد یا گروہ کے خلاف نوٹس جاری کرسکتا ہے یاعدالت میں مقدمہ چلاسکتا ہے۔

مساوی مواقع کمیشن۔ ہندوستانی منظرنامہ : ہندوستانی معاشرہ ایک اعلیٰ درجے کے معاشرتی طبقات اورعدم مساوات سے متصف ہے جوگروہی صفات جیسے ذات، نسل، مذہب، نسب، رنگت، علاقہ اورمعاشرتی تعلق کی صورت میں پائے جاتے ہیں۔ یہ عوامل یہاں پراتنے ہی اہم ہیں جتنے کسی اورجگہ، تاہم ہندوستان، اپنی ذات پات اورنسل کی بنیاد پرطبقاتی تقسیم کےلحاظ سے منفرد ملک ہے۔

مملکت اوراس کی پالیسی بنانے والے ان عوامل کی مداخلت کوتسلیم کرتے ہیں کیوں کہ بعض طبقات پراس کے مضراثرات مرتب ہوتے ہیں، حکومت سے اُن طبقات پر جوتاریخی امتیاز اورمعاشرتی کا شکار بنتے ہیں۔

امتیاز کے خلاف، حکومت کے اقدامات پر جودستور ہند کے تشکیل شدہ قوانین کی متابعت میں کئے گئے ہیں وہ یہ تیقن فراہم کرتے ہیں

- قانون کے سامنے سب برابر
- محروم طبقات کی ترقی کے لیے تعلیمی اورمعاشی مفادات کوفروغ دینے کے لیے خصوصی توجہ
- معاشرتی ناانصافی اور ہرقسم کے استحصال سے تحفظ
- چھوت چھات کی وجہ سے پیداہوئے امتیاز کودستور ہندختم کردیتا ہے۔

ہندوستان جیسے ملک کی نظرمیں، ایسے فیصلے اوراقدامات، وسیع پیمانے پرسبق آموز ہیں۔ ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ان اقدامات کی وجہ سے ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی قائم کی جانی چاہئے تھی جوہندوستان میں مسلم طبقات کی معاشی اورتعلیمی حالت کا مطالعہ کرسکے۔

9مارچ 2005ء کوسچر کمیٹی کا قیام اور 17 نومبر 2006ء کواُس کی رپورٹ کی پیش کشی اُس دہائی میں عمل میں آئی۔ جس عرصے میں برطانوی حکومت نے بھی شمولیاتی اقدامات کا آغاز کیا۔مسلمان جیسے بڑے طبقے کے حالات کے مطالعہ کے معاملے میں ہندوستان تاریخ میں کبھی بھی پیچھے نہیں رہے جوتجربے اورمشاہدے کے اعتبار سے ایک واضح تشریح پسماندہ اورنظرانداز کئے گئے طبقے کے بارے میں پیش

مضامین

کر سکے۔

مساوی مواقع کمیشن کی ضرورت کیوں؟: مساوات' ہندوستان کی جمہوریت کی ایک اساسی قدر ہے۔ اس کو دستور ہند کے بنیادی حقوق اور مملکت کی پالیسیوں کے رہنمایانہ اصولوں کی شکل میں عوامی زندگی میں وسیع پیمانے میں مشتہر کیا گیا ہے۔ پھر بھی معاصر معاشرے میں شدید نوعیت کی عدم مساواتیں موجود ہیں جو مستقبل کی نسل کی ترقی کے مواقع کو متاثر کرتی ہیں۔ سب سے بدترین عدم مساوات اکثر معاشرتی گروہوں اور طبقات سے متعلق ہو جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے بین طبقاتی عدم مساوات پہلے سے زیادہ نمایاں ہو جاتی ہیں۔ یہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ ان عدم مساواتوں کا جائزہ لیا جائے اور تحفظات کی موجودہ پالیسیوں کا جائزہ لیا جائے اور آگے کی طرف لے جانے والے مثبت اقدامات کا آغاز کیا جائے۔ اسی وجہ سے یہ خیال کیا گیا کہ ہندوستان کو مساوی مواقع کمیشن کی ضرورت ہے۔ مجوزہ مساوی موقع کا کمیشن ایک راہ تلاش کرنے والے ادارہ کی حیثیت سے کام کرے گا جو ایک ایسے طریق عمل کی نشان دہی کرے گا اور یہ ادارہ تجربات کی اتباع کرتے ہوئے مثبت کارروائی کے لئے اقدامات تجویز کرے گا اور ان کی جانچ کے طریقے بھی وضع کرے گا۔

سچر کمیٹی کی سفارشات میں ایک سفارش مساوی موقع کے کمیشن کے قائم کرنے کے بارے میں ہے تاکہ ہندوستانی معاشرے میں نظرانداز کیے گئے طبقات کے لیے معاشرتی انصاف کو یقینی بنایا جاسکے اور ان کے لیے مساوی مواقع فراہم کیے جاسکیں۔ سچر کمیٹی نے برطانیہ کے نمونے کی اتباع کی جس نے نسلی تعلقات کا قانون (Race Relation Act) بابتہ 1976ء منظور کیا تھا۔

''مختلف اقسام کے امتیاز کی تلافی کے طریق عمل کو فراہم کرتے ہوئے یہ اقلیتوں کو مزید تیقن دے گا کہ ان کے خلاف کسی بھی غیر صحیح کارروائی یعنی عمل قانونی کارروائی کی راہ ہموار کرے گا۔''

تاہم' سچر کمیٹی کی رپورٹ نے مساوی موقع کمیشن کے قائم کرنے کے بارے میں تفصیلات نہیں فراہم کیں۔ اُس نے یہ کام حکومت کے لیے چھوڑ دیا۔ اس کمیٹی نے اس بات کی بھی وضاحت نہیں کی کہ یہ کمیشن' قومی اقلیتی کمیشن سے خدمات انجام دینے کے معاملے میں اور اس کی ہیئت ترکیبی میں کس طرح مختلف ہوگا۔ یہ بھی واضح نہیں ہے کہ آیا مساوی موقع کمیشن اور قومی اقلیتی کمیشن ایک ساتھ موجود رہیں گے یا مساوی موقع کمیشن' قومی اقلیتی کمیشن کی جگہ لے لیگا۔

اس رپورٹ میں آگے چل کر یہ تحریر کیا گیا ہے کہ ''محرومی' غریبی' امتیاز سارے معاشرتی اور مذہبی طبقات میں موجود ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ کہ وہ مختلف تناسب میں ہوں گے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ خامیاں' اقلیتی طبقہ میں پائی جاتی ہیں جو اس طبقے میں اندرونی طور پر حساس نوعیت کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ یہ حساسیت فطری ہے اور شاید اس نوعیت کی حساسیت ملک کی دیگر مذہبی اقلیتوں میں

بھی پائی جاتی ہو۔''

دستوری تیقنات کے باوجود کئی مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کے خلاف کھلا تعصب برتا گیا ہے۔ یہ الزام دیا گیا ہے کہ قومی اقلیتی کمیشن کو حقیقی قانونی اختیارات نہیں دیئے گئے ہیں تاکہ وہ ملک میں جاری رہنے والے امتیازات کو ختم کرسکے۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کئی دانشوروں نے یہ محسوس کیا کہ منصفانہ شمولیت کے لیے مساوی موقع کمیشن ضروری ہے۔

مادھومینن کمیٹی: سچر کمیٹی کی سفارشات کی اساس پر ہندوستان کی حکومت نے پروفیسر این آر مادھومینن کی صدارت میں ماہرین کی ایک کمیٹی کا 31 آگسٹ 2007 کو تقرر کیا تاکہ مساوی موقع کمیشن کی ہیئت ترکیبی کے دائرۂ عمل کا جائزہ لے کر تجاویز پیش کی جاسکیں۔ ان ماہرین نے 28 فروری 2008ء کو اپنی سفارشات پیش کردیں۔ جس میں مساوی موقع کمیشن کا مسودہ قانون بھی تھا۔ ان ماہرین نے ان تجاویز کو مختلف جمہوری اقوام کے اسی نوعیت کے قوانین کا مطالعہ کرنے کے بعد ہندوستان کے دستور کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا تھا۔ یہ مسودہ مساوی موقع کمیشن کی
تشکیل کے لئے فراہم کیا گیا تھا جو کہ حکومت کے لئے فعال اور خود مختار ہونا تھا۔

- مساوی موقع کمیشن' ایک ایسا ادارہ ہوگا جو کسی طبقے سے امتیاز کے بارے میں ثبوت اکٹھا کر کے اُس کی اشاعت کرے گا۔ یہ ثبوت پر مبنی معاملات کی وکالت کرے گا جن میں علمی تحقیق اور تفصیلات اکٹھا کرنے کے کام سلسہ میں کئی امور شامل ہیں۔
- ان امور کے علاوہ مساوی موقع کمیشن کارکردگی کی نگرانی اور جانچ کرنے کا کام بھی اپنے ذمے لے گا تاکہ قوانین اور پالیسیوں کی اثر پذیری کا جائزہ لیا جاسکے۔ مختلف اداروں کے لیے یہ مشاورت کا کام کرے گا اور حکومت کی مختلف سطحوں پر رہنمائی کرے گا علاوہ ازیں حکومت کی پالیسی میں مداخلت کرے گا اور تکالیف کی تلافی کے کام بھی انجام دے گا۔ ان امور کی انجام دہی کے لیے مساوی موقع کمیشن کو شہری عدالت کے اختیارات حاصل ہونے چاہیں تاکہ وہ تحقیق و تفتیش کرسکے۔ جیسے کمیشن کے سامنے حاضر ہونے کے لیے سمن (Summon) جاری کرنا اور دستاویز پیش کرنے کے لیے حکم دینا' گواہوں کا حلفیہ بیان درج کرنا' معلومات کے حصول کے لیے دستاویزات طلب کرنا اور ریکارڈ کا معائنہ کرنا وغیرہ۔

مساوی موقع کمیشن کے بعض اہم فرائض حسب ذیل ہیں:

- مساوی موقع کے کمیشن کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں حکومت نے کسی عہدہ دار محکمہ کی خدمات حاصل کرسکتا ہے اور شکایت کنندگان کو قانونی امداد فراہم کرسکتا ہے۔
- مساوی موقع کمیشن اختیارات حاصل کرنے کی غرض سے مسودہ ترتیب دے سکتا ہے تاکہ اُسے امتیاز سے متعلق سنوائی کے اختیارات حاصل ہوسکیں۔

مضامین

ا مساوی موقع کمیشن کا اہم فریضہ تاہم' یہ ہونا چاہئے کہ سارے متعلقہ اصحاب سے مشورہ کرکے ''اچھے قواعد کا ضابطہ'': (Good Practice Code-GPC) تیار کرے۔

ا اچھے قواعد کا ضابطہ (GPC)' تعلیمی اداروں آجرین اور دیگر اداروں (رہائشی مکانات تعمیر کرنے والے ادارے) کے لیے اساسی قواعد مرتب کرے گا جو زیادہ شفاف طریقے فراہم کریں گے۔ جس سے امتیاز کے امکانات ختم ہوجائیں گے۔

ا اچھے قواعد کا ضابطہ (GPC) قانی احکامات کی طرح ہوگا۔ جس کی اتباع کرنا ہرایک کے لیے لازمی ہونا اوراس کی خلاف ورزی مستوجب سزا ہوگی۔ GPC کی عمل آوری سے دو برسوں تک تجربات سے سبق حاصل کرکے اور متعلقہ افراد سے مشاورت کے بعد' مساوی موقع کمیشن' مساوی موقع کے طریق عمل کا ضابطہ (Equal Opportunity Practice Code) مدون کرے گا۔

ا حتمی طور پر مساوی موقع کمیشن' مساوی موقع طریق عمل کی عمل آوری کے اختیارات حاصل کرے گا تاکہ اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف عدالتی کارروائی کی جاسکے تاہم مشکل مسئلہ یہ ہے کہ مساوی موقع کے کمیشن کو قابل تعمیل احکامت کی اجرائی کا قانونی اختیار حاصل نہیں ہے اور وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف تحقیر کی کارروائی نہیں کرسکتا۔ اس کو جتنے اختیارات دیے جانے چاہیے اس سے کم اختیارات عطا کیے گئے ہیں۔ مساوات کا سلوک کرنا' کسی بھی امن پسند اور ہم آہنگ معاشرے کے لیے شرط لازمی ہے اور دستور کی طرف سے تفویض کردہ اختیار ہے۔

اختتامیہ: مساوی موقع کمیشن' جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ بتلاتا ہے کہ یہ سارے محروم کردہ طبقات جس میں اقلیتیں بھی شامل ہیں اور اکثریتی طبقات کے برابر مساوی سہولتوں کی فراہمی کا تیقن دیا گیا ہے جو ایک موثر ہتھیار ثابت ہوسکتا ہے۔ جمہوریت میں سارے شہریوں کو بلالحاظ ذات' نسل یا جنس مساوی مواقع ملنے چاہئیں۔ اور دستور' مساوی مواقع فراہم کرتا ہے۔ مادھومنین کمیٹی کی یہ رائے ہے کہ ملک میں مساوی موقع کمیشن کی ضرورت ہے اور اس نے حکومت ہند سے سفارش کی، کہ رپورٹ میں پیش کردہ اس کی تجاویز کے مطابق مساوی موقع کمیشن کا قیام عمل میں لایا جانا چاہئے۔ جلد یا دیر' مساوی موقع کے کمیشن کا قیام' دستور ہند کے وعدہ کی تکمیل کی طرف ایکا ہم اقدام ہوگا جس میں ہندوستان کے سارے شہریوں کو مساوی مواقع حاصل ہوں گے۔

☆☆☆

ڈاکٹر شیخ عبدالطہ
اسسٹنٹ پروفیسر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی' حیدرآباد
سیل: 9440310570

مضامین

ہندوستان میں درج فہرست ذات اور درج فہرست قبائل کے لئے تحفظاتی پالیسی: ایک جائزہ

تحفظات کا تصور: تحفظات کی پالیسی یا مثبت اقدام کی پالیسیاں یا ترجیحی سلوک اور معاوضاتی انصاف ان مختلف طریقوں میں سے ایک ہے جنہیں مثبت مساوات کے فروغ کے لئے اپنایا گیا ہے۔ غالب اور مظلوم طبقات کے درمیان تباہ کن حالات اور سماجی تصادم سے بچنے کے لئے مثبت انصاف کے تصور کو اپنایا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس طرح کے حالات کو صرف مساوات اور عدم امتیاز پر مبنی زیادہ مساوی سماج کے قیام سے ہی روکا جاسکتا ہے۔

ہندوستان میں تحفظات مثبت اقدام کی ایک شکل ہے جس میں تعلیمی، سماجی اور انتظامی اداروں میں کم نمائندگی رکھنے والے مختلف برادریوں کی کم از کم نمائندگی کو یقینی بنانے کے لئے نشستوں کی تعداد یا فیصد کو مختص کیا جاتا ہے۔

تحفظات تاریخی طور پر ہندوستانی سماج کے محروم طبقات کی شرکت اور با اختیاری کو یقینی بنانے کی مملکت ہندوستان کی ایک سماجی پالیسی ہے جو سماجی و معاشی طور پر پسماندہ و محروم طبقات جیسے درجہ فہرت ذاتیں (SC)، درجہ فہرست قبائل (ST) اور دوسرے پسماندہ طبقات (OBC) کو اوپر اٹھانے کا ایک قدم ہے۔ دراصل یہ محض ایک مخصوص کوٹہ مقرر کرنے کا طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ ذات، نسل، مذہب، جنس وغیرہ سے اوپر اٹھ کر سب کے لئے مواقع فراہم کرتے ہوئے سماج کو متحد اور مضبوط بنانے کا ایک مشن ہے۔ اس کے علاوہ سماجی دھارے سے الگ آزادی و وقار سے محروم طبقات کو سہارا دیکر ایک تمدنی سرمایہ (Cultural Capital) بنانا بھی اس پالیسی کا مقصد ہے۔

تحفظات کا مقصد تعلیمی اداروں، ملازمتوں اور قانون ساز اداروں میں داخلہ کی شرائط کو چند قابل شناخت گروہوں کے لئے جو آبادی کے تناسب سے کم نمائندگی رکھتے ہیں کم کرتے ہوئے سماجی تنوع میں اضافہ کرنا ہے۔ تحفظات کو تین زمروں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ (1) تعلیمی تحفظات، (2) ملازمت میں تحفظات اور 3) سیاسی تحفظات۔ ان تین تحفظات کے علاوہ حکومتی اسکیمات جیسے فراہمی امکنہ اور دیگر فلاحی اسکیمات میں کوٹہ متعین کیا جاسکتا ہے۔

مرکزی حکومت کے زیر انتظام تعلیمی اداروں میں 22.5 فیصد تحفظات، 15% درج فہرست ذاتوں، 7.5% درج فہرست قبائلیوں کیلئے ہیں۔ تحفظات کے اس فیصد کو دیگر پسماندہ طبقات او بی سیز کیلئے زائد 27 فیصد دیتے ہوئے جملہ 49.5 فیصد کیا گیا۔ درجہ فہرست ذاتوں کے لئے 15 فیصد اور درج فہرست قبائلیوں کو 7 فیصد تحفظات پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے انتخابات میں بھی عمل کیا جارہا ہے۔ چند ریاستوں جیسے ٹاملناڈو میں درج فہرست ذاتوں کے لئے

مضامین

18 فیصد اور درج فہرست قبائل کیلئے ایک فیصد مقامی آبادی کی بنیاد پر دیئے گئے ہیں۔ آندھراپردیش میں دیگر پسماندہ طبقات کے لئے 15 فیصد، درج فہرست ذاتوں کیلئے 6 فیصد درج فہرست قبائیلیوں اور پسماندہ طبقات کے لئے 25 فیصد اور مسلم پسماندہ طبقات کے لئے 4 فیصد کل 50 فیصد تحفظات ذات کی بنیاد پر دیئے گئے ہیں۔

دستور ساز اسمبلی میں مذہبی اقلیتوں کو تحفظات کے دائرے میں لانے پر طویل بحث چلی۔ مذہب کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کی وجہ سے پیدا ہونے والے ماحول میں اقلیتوں کو مذہبی بنیاد پر تحفظات فراہم کرنے کو تائید حاصل نہیں ہوئی۔ البتہ دیگر پسماندہ طبقات کو دئے گئے 27 فیصد تحفظات میں کئی مسلم پسماندہ طبقات بھی شامل ہیں۔ کیرالا، تملناڈو، کرناٹک، یوپی، بہار، آندھراپردیش کے علاوہ دیگر کئی ریاستوں میں بھی مسلم پسماندہ طبقات کو تحفظات کے زمرے میں شامل کیا گیا ہے۔ انہیں مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ ان کی سماجی پسماندگی کی وجہ سے تحفظات کے دائرے میں شامل کیا گیا ہے۔

درجہ فہرست ذاتوں کو دئے گئے تحفظات سے مسلم اور عیسائی دلتوں کو باہر رکھا گیا ہے جبکہ ہندو، سکھ اور بدھ مت کے دلتوں کو درجہ فہرست ذاتوں میں شامل کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ درجہ فہرست قبائیلیوں کو دئے گئے تحفظات میں مذہب کی کوئی قید نہیں ہے۔ قبائلی علاقوں میں رہنے والے تمام افراد چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان تحفظات سے استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔

روزگار میں تحفظات:

تحفظات کی پالیسی کا سب سے اہم پہلو حکومتی خدمات میں تحفظات سے جڑا ہے۔ دستور کی دفعہ 16(4) کے تحت مملکت کو ''تقررات یا عہدوں کے لئے شہریوں کے کسی بھی پسماندہ طبقہ کے لئے تحفظات فراہم کرنے کا اختیار'' دیا ہے۔ اور دفعہ 16(5) کے تحت مملکت کو خدمات میں درج فہرست ذاتوں اور قبائل کے لئے کسی بھی درجہ کے عہدوں کے لئے ترقی کے معاملہ میں تحفظات فراہم کرنے کا اختیار ہے۔ چنانچہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے حکومت نے درج فہرست ذاتوں اور قبائل کی آبادی کے تناسب سے ان کی حصہ داری کا تعین کرتے ہوئے انہیں تحفظات عطا کئے ہیں اسکے بعد دیگر پسماندہ ذاتوں (او بی سیز) کے لئے بھی تحفظات دیئے گئے ہیں۔ برسرروزگار افراد کے ترقی کے لئے بھی تحفظات ہیں۔ حکومتی خدمات میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو سیول سرویسس عوامی شعبہ کے اداروں، قانونی اور نیم حکومتی اداروں اور حکومتی امداد حاصل کرنے والے اداروں میں کام کرتے ہیں۔ تاہم' مرکزی سطح پر چند خدمات کو تحفظات کی پالیسی سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔ ان میں خاص طور پر دفاع اور عدلیہ کے شعبے شامل ہیں۔

تعلیم میں تحفظات:

تحفظات کی پالیسی کے دوسرے اہم ترین پہلو کا تعلق تعلیم سے ہے۔ دستور کی دفعہ 15(4) میں مملکت کو درج فہرست ذاتوں اور قبائل کی تعلیمی ترقی کیلئے خصوصی

قانون سازی کرنے کے لئے کہا گیا ہے اور حالیہ عرصہ میں یہ بات دیگر پسماندہ طبقات کے متعلق بھی کہی گئی ہے۔ چنانچہ اس دفعہ کی منشاء کو پورا کرنے کے لئے مرکزی اور ریاستی حکومتوں اور حکومتی امداد سے چلنے والے تمام اداروں میں ایس سی ، ایس ٹی اور دیگر پسماندہ طبقات کے طلباء کے لئے نشستیں محفوظ کی گئی ہیں۔بشمول آندھراپردیش کئی ریاستوں میں خواتین کو بھی تعلیمی اداروں میں تحفظات دئے گئے ہیں۔ اسکے علاوہ کئی ایک مالی اسکیمات کے ذریعہ خصوصا وظائف، خصوصی ہوسٹل کے ذریعہ ایس سی/ایس ٹی اور او بی سی طلبہ کو سہولتیں فراہم کی جارہی ہیں اسی طرح کوچنگ اور کتابوں کے لئے مالی امداد اور فیس میں رعایتیں دی جارہی ہیں۔

قانون ساز اداروں میں تحفظات: تحفظات کی پالیسی کا تیسرا اہم میدان مرکزی اور ریاستی مقنناؤں میں تحفظات سے متعلق ہے۔ دستور کی دفعہ 330 ‘ 332 اور 334 کے تحت ST/SC کی آبادی کے تناسب سے مرکزی و ریاستی مقنّنہ میں ان کے لئے نشستیں محفوظ کی گئی ہیں۔ اس طرح کے تحفظات خواتین اور او بی سیز کے لئے شہری و دیہی مقامی سطح کے اداروں میں ضلع، تعلقہ اور دیہات کی سطحوں پر فراہم کئے گئے ہیں۔ ST/SC کی سیاسی شرکت میں اضافہ کے لئے قانونی توضیحات کے ذریعہ بھی ان کی مدد کی گئی ہے چنانچہ ان کے لئے انتخابی پرچہ نامزدگی کے ادخال کے وقت بھری جانے والی رقم (ڈپازٹ) بھی کم رکھی گئی ہے۔

سیاسی نمائندگی کے لئے تحفظات کے لئے متعینہ وقت کی حد ہے۔ ابتداء میں انہیں صرف دس سالہ مدت کے لئے رکھا گیا تھا، لیکن قانون سازی کے ذریعہ ہر دس سال کے بعد مزید دس سال کے لئے اس میں توسیع کی جارہی ہے۔ تاہم‘ حکومتی خدمات اور تعلیم کے میدانوں میں تحفظات کو جاری رکھنے یا رکھنے کے متعلق فیصلہ کو حکومت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ جب تک حکومت یہ سمجھتی ہے کہ ST/SC اور دیگر پسماندہ طبقات کی ترقی کے لئے تحفظات ضروری ہیں‘ انہیں جاری رکھ سکتی ہے۔

تحفظات کی تائید میں دلائل: منڈل کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ذات پات ہندوستان کی آدھی سے زیادہ آبادی کی مشکلات کی ایک اہم وجہ ہے۔ چنانچہ ذات پات کوختم کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ ہم غیر مراعات یافتہ عوام کی مدد کریں تا کہ وہ تعلیم میں بہتر مظاہرہ کرسکیں اور اعلیٰ ذات کے عوام کے برابر وہ بھی سماجی رتبہ پاسکیں۔

قابلیت/میرٹ کی دلیل میں کوئی بڑی منطق نہیں ہے۔ قابلیت کسی کا کوئی پیدائشی حق نہیں ہے۔ اور سماج کے بعض طبقات تاریخی وجوہات کی بناء پر ترقی حاصل کئے ہیں جن میں جاری ذات پات کے سخت نظام کا بڑا دخل ہے۔ تحفظات کی تائید میں دلیلیں اس طرح ہیں۔

(1) تحفظات ایک دستوری ضرورت ہے، یہ نہ صرف ہندوستانی جمہوریت کی بنیاد ہیں‘ بلکہ یہ خود جمہوریت کے تحفظ کے لئے بھی ضروری ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ محروم اور حاشیائی گروہ بھی یہ محسوس کریں کہ وہ بھی ہندوستانی قومی مملکت کا

ایک لازمی جز ہیں، اورانہیں قومی دھارا میں شامل ہونے کی اہمیت کا احساس دلایا جائے۔

(2) آج بھی جاری ذات پات پر مبنی امتیاز کی وجہ سے بھی تحفظات کو جائز و صحیح قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہندوستانی سماج کی ذات کی بنیاد پر تقسیم سماجی انقلاب کی ناکامی کو بتاتی ہے، ایک مساوی سماج کو قائم کرنے کے لئے تحفظات کو جاری رکھنا ایک سماجی ضرورت بن جاتی ہے۔

(3) محروم اور حاشیائی گروہ عددی اکثریت کے حامل ہیں، جنکے حقوق کو کچلا گیا ہے اور عددی اقلیت نے ہندوستان کی تاریخ کے ہر دور میں انہیں ان کے حقوق و مراعات سے محروم رکھا ہے۔ ان حقائق کی روشنی میں تاریخی غلطیوں کو ابھی تک درست نہیں کیا گیا ہے، اس لئے تحفظات کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے۔

تحفظات کے خلاف دلائل: تحفظات کے مخالفین تحفظات کو پسماندہ طبقات کی جانب سے ایک طویل مدتی حکمت عملی سمجھتے ہیں جس کا مقصد دوسروں کی قیمت پر اپنے لئے کچھ حاصل کرنا ہے۔'' وہ لوگ جو حکومت کے اس مثبت اقدام کی مخالفت کرتے ہیں ''اعلیٰ اہلیت'' (میرٹ) کے بڑے حامی دکھائی دیتے ہیں۔ تحفظات کے خلاف دلائیل اس طرح ہیں:

(1) تحفظات کی وجہ سے اہلیت رکھنے والے ذہین لوگ ہندوستان سے باہر اپنے لئے مواقع حاصل کرلیں گے۔ جس سے ہندوستان اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل دماغ و ذہن سے محروم ہوجائے گا۔

(2) تحفظات کی وجہ سے ایک فرد میں پنہاں صلاحیت واستعداد کو کچلنے کا رجحان پیدا ہوگا جس کی وجہ سے مجموعی طور پر پورے نظام کی کارکردگی متاثر ہوگی اور اس پر ایک منفی اثر پڑے گا۔

(3) تحفظات کے فوائد سے صرف چند ذاتیں اور گروہ ہی استفادہ کریں گے جس کی وجہ سے پسماندہ طبقات میں ایک برتر یا غالب گروہ پیدا ہوگا۔

(4) تعلیم کے ابتدائی مرحلوں میں کوئی امتیاز یا خصوصی مواقع نہیں ہیں، لیکن اعلیٰ تعلیم اور یا ملازمت کی سطح پر تحفظات دیئے گئے ہیں اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ SC/ST/OBCs کے لوگ اعلیٰ طبقات کے مقابلہ میں کم ذہین ہوتے ہیں اور یہ ایک تنگ نکتہ نظر ہے۔

(5) تحفظات کی پالیسی سیاسی جماعتوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتی ہے جسے وہ اپنے انتخابی فوائد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے سیاسی جماعتوں کو عوام کو مختلف ٹکڑوں اور گروہوں میں بانٹنے کا موقع مل جاتا ہے۔

(6) تحفظات کی پالیسی معاشی موقف کے مقابلہ میں سماجی بنیادوں پر زیادہ زور دیتی ہے لیکن آج کے بدلتے عالمیانہ اور آزاد معیشت کے منظر میں سماجی بنیادوں پر تحفظات فطری معاشی نمو میں ایک رکاوٹ ہے جس کی وجہ سے تحفظات کا سارا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے۔

تنقیدی جائزہ : تحفظات کی اچھی پالیسی وہ پالیسی ہوتی ہے جس سے کارکردگی اور اعلیٰ اہلیت (میرٹ) کو نقصان پہنچائے بغیر ایک قوم کے طور پر ہمارے اتحاد کو توڑے بغیر اور ترقی کی جانب ہماری پیشرفت میں رکاوٹ بنے بغیر سماج کے ضرورت مند طبقات کو فائدہ پہنچائے۔

تحفظات کی پالیسی کو سائنٹفک بنانے کیلئے حسب ذیل امور پر غور کیا جانا چاہئے:

1۔ تحفظات کے فوائد سے پسماندہ ذاتوں کے ترقی یافتہ طبقہ کو دور رکھنے کیلئے موثر اقدامات کو اپنایا جانا چاہئے۔

2۔ تحفظات صرف ایک نسل تک محدود ہوں۔ بعد کی ذیلی نسلوں کے لئے یہ لازمی کیا جائے کہ وہ عام درجوں کے ساتھ مسابقت کرکے آگے بڑھیں۔

3۔ تحفظات کی پالیسی کا ہر چند برسوں کے بعد دوبارہ جائزہ لیا جائے تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ اس کا غلط استعمال نہ ہو اور یہ کہ اس کی وجہ سے انتظامی معیارات اور کارکردگی پر اثر نہ پڑنے پائے۔

4۔ تحفظات کو دستیاب ملازمتوں کے ایک چھوٹے سے فیصد تک محدود کیا جانا چاہئے۔

5۔ متعلقہ مقنّنہ کی منظوری کے بغیر تحفظات کو نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی جانی چاہئے۔ تحفظات کی پالیسی کو اپنانے سے قبل مقنّنہ اور اس سے باہر کھلے و آزادانہ مباحث ہونے چاہئیں تاکہ حکومت کو رائے عامہ معلوم ہو سکے اور آبادی کے تمام طبقات کے لئے قابل قبول قانون سازی ہو سکے۔

ماحاصل: دستور ہند ایک سماجی دستاویز ہے اور تحفظات کی پالیسی کو سماجی مصالحت اور اقتدار میں حصہ داری کی ایک کلید کے طور پر تیار کیا گیا ہے۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے قوم پر مکمل وفاداری، مثبت سوچ، منصفانہ منصوبہ بندی، مناسب و موزوں جستجو تمام پیش قدمیوں کو یکجا کرتے ہوئے اور بے تکان عزم کے ساتھ حکمرانی کی جانی چاہئے۔ مختصراً یہ کہ ایک کامیاب اور مکمل موثر حساس شمولیتی حکمرانی ہو تاکہ قوم کے لئے ترقی کے ایک ایسے عہد میں لے جایا جا سکے جہاں ترقی کا مطلب سب کی ہمہ جہتی ترقی ہو۔ تحفظات کی پالیسی اپنی شکل اور مظاہر میں ہندوستان کی شمولیتی ترقی کے لئے ایک کامیاب و موثر شمولیتی پالیسی یا حکمت عملی ہو۔

//............☆☆............//

محمد عبدالرحیم
پی ایچ۔ڈی، ریسرچ اسکالر
شعبہ نظم و نسق عامہ،
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی'
گچی باؤلی' حیدرآباد 032 500
Mobile: 8686837698

حیدرآباد ریاست میں ریڈیو نشریات

الکٹرانک میڈیا، کہنے کو تو یہ دو چھوٹے سے الفاظ ہیں لیکن اس کی اہمیت اور رسائی کی وجہ سے آج ساری دنیا ایک مٹھی میں سما گئی ہے۔ آج تک دنیا کو گلوبل ویلیج کہا جاتا رہا ہے لیکن اب گلوبل ویلیج کا نظریہ بھی قصہ پارینہ بن چکا ہے کیونکہ آئے دن ہر نئی ایجاد دنیا کو مختصر سے مختصر کرتی جارہی ہے۔ آج دنیا کسی فرد واحد کی مٹھی میں بند چھوٹے سے اسمارٹ فون میں قید ہو کر رہ گئی ہے۔ فی زمانہ الکٹرانک میڈیا انسانی زندگی کا ایک ایسا لازمی جز بن چکا ہے جس کے بناء روز مرّہ زندگی کا تصور محال ہو چکا ہے۔ ٹکنالوجی کے میدان میں ٹیلی گراف سے ٹیلی فون، ریڈیو سے ٹیلی ویژن، کمپیوٹر انٹرنٹ سے موبائل فون اور اسمارٹ فون تک ترقی کا سفر طئے کرتے ہوئے دنیا میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔

جدید وسائل اور ٹکنالوجی ہر عام و خاص کے دسترس تک رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ اسکے مقابل ماضی میں ٹکنالوجی اور نئی ایجادات کی عوام تک رسائی کے لئے سرکاری انتظامیہ کو کافی مشقت کرنی پڑتی۔ جدید ٹکنالوجی اور وسائل کے حوالہ سے سابقہ حیدرآباد ریاست کو ایک منفرد مقام حاصل تھا۔ سلطنت آصفیہ نہ صرف ایک خوشحال ریاست تھی بلکہ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں بھی دیگر علاقوں اور ریاستوں کے مقابل کافی ترقی یافتہ مانی جاتی تھی۔ عوام کی فلاح اور انہیں بہتر سہولیات کی فراہمی کے لئے پرنٹنگ ٹکنالوجی، ریلوے لائین، ٹیلی گراف و ٹیلی فون اور ریڈیو جیسی نئی ایجادات دیگر ریاستوں سے قبل حیدرآباد ریاست میں متعارف اور مستعمل ہو چکی تھیں۔

ہندوستان پر مسلط حکومت برطانیہ نے جب چیمبر آف پرنسیس کے ذریعہ فارن اینڈ پولیٹکل ڈپارٹمنٹ کی قرارداد مورخہ ۲۷ رمئی ۱۹۲۶ کے بموجب ہندوستان اور اس کی خودمختار ریاستوں کو ریڈیو براڈکاسٹنگ شروع کرنے کی منظوری دی تو آصفیہ حکومت نے بھی حیدرآباد ریاست میں ریڈیو نشریات شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ بعد ازاں ۲۲ رفروری ۱۹۳۲ کو ایک اور قرارداد کے ذریعہ انگریزی حکومت نے ہندوستان اور اس کی علاقائی ریاستوں میں باضابطہ طور پر ریڈیو براڈکاسٹنگ سروس کی منظوری کو قطعیت دی۔

حیدرآباد ریاست میں وائیرلیس (لاسلکی) ٹرانسمیٹنگ اسٹیشن کا قیام: حیدرآباد ریاست میں جدید مواصلاتی نظام کی بنیاد ڈالنے کا کارنامہ حیدرآباد کے پوسٹ ماسٹر جنرل محمد احمد اور محکمہ ریلوے، میل سرویس کے سپرینٹنڈنٹ محبوب علی نے انجام دیا۔ پوسٹ ماسٹر جنرل محمد احمد نے ریاست حیدرآباد میں آزمائشی لاسلکی ٹرانسمیٹنگ اسٹیشن کے قیام کے لئے متعلقہ محکمہ کو ایک درخواست روانہ کی۔ آزمائشی ٹرانسمیٹنگ اسٹیشن کے قیام کی منظوری ملنے کے بعد

مضامین

محکمہ ریلوے کے ملازم محبوب علی کے زیرنگرانی وائرلیس ٹرانسمیٹنگ اسٹیشن کے آلات کی تنصیب عمل میں آئی۔ ان آلات کو محبوب علی نے بمبئی (موجودہ ممبئی) سے منگوایا تھا۔ حکومتِ آصفیہ کی درخواست پر حکومت ہند نے اس آزمائشی لاسلکی ٹرانسمیٹنگ ریڈیو اسٹیشن کے لئے تجرباتی لائسنس منظور کرتے ہوئے ۲۵۰ تا ۳۰۰ میٹرس اور ۷۵ تا ۸۰ میٹرس کے بینڈس پر فریکونسی مختص کی۔ تجرباتی طور پر قائم کردہ اس ریڈیو اسٹیشن کے لئے (وی یو ۷ ایچ اے) نامی کوڈ مختص کیا گیا۔ ڈسمبر ۱۹۳۳ سے ریاست حیدرآباد میں ۷۵ واٹ گنجائش والے ٹرانسمیشن کے ذریعہ خانگی سطح پر بھی ریڈیو نشریات کا آغاز کیا گیا۔ ریڈیو نشریات کو آصفیہ حکومت کے دارالحکومت شہر حیدرآباد سے دو سو میل کے احاطے میں موجود تمام اضلاع کے ہیڈ کوارٹرس پر کامیابی کے ساتھ سُنا جانے لگا۔ تجرباتی طور پر قائم کردہ اس اسٹیشن سے روزانہ خبریں اور مقامی موسیقی کے پروگرام نشر کئے جاتے۔

آزمائشی ٹرانسمیٹنگ اسٹیشن کی کامیابی کے بعد آصفیہ حکومت نے سال ۱۹۳۵ میں ریڈیو اسٹیشن کو مکمل طور پر اپنی نگرانی میں لیتے ہوئے حیدرآباد میں ایک مستقل ٹرانسمیٹنگ اسٹیشن قائم کرنے کی ذمہ داری مارکونی کمپنی کو سونپی۔ ریاست میں ریڈیو نشریات کے دائرہ کار کو وسیع کرنے کے مقصد سے آصفیہ حکومت نے حیدرآباد کے علاوہ اورنگ آباد، ورنگل اور گلبرگہ میں مزید تین ٹرانسمیٹنگ اسٹیشن قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اورنگ آباد، ورنگل اور گلبرگہ علاقوں کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ علاقائی اعتبار سے مراٹھواڑ علاقہ میں واقعہ اورنگ آباد میں مراٹھی زبان، علاقہ تلنگانہ میں واقع ورنگل میں تلگو زبان اور گلبرگہ اور اس کے اطراف و اکناف کے بیشتر علاقوں میں کنڑ زبان بولنے اور سمجھنے والی آبادی کثرت سے پائی جاتی تھی۔ ریاست کے ان تین علاقوں میں علیحدہ علیحدہ زبانیں بولی اور سمجھی جاتی تھیں جس کے باعث آصفیہ حکومت نے ان تینوں علاقوں میں نشریاتی مراکز (ریلے سنٹرس) قائم کرتے ہوئے وہاں کی مادری زبانوں میں عوام تک ریڈیو نشریات کی رسائی کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلہ میں اورنگ آباد میں ٹرانسمیٹنگ اسٹیشن کا تعمیری کام شروع کردیا گیا تھا جبکہ ورنگل اور گلبرگہ کے لئے محکمہ پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف سے مخصوص فریکونسی مختص اور محفوظ کروالی گئی تھی۔ لیکن اچانک دوسری جنگ عظیم چھڑ جانے اور انگلینڈ و امریکہ سے ٹرانسمیٹنگ اسٹیشنوں کے قیام کے لئے آلات کے حصول میں پیش آرہی دشواریوں کے باعث ورنگل اور گلبرگہ میں ٹرانسمیٹنگ اسٹیشن کے قیام کا منصوبہ منسوخ کرنا پڑا۔[۱]

ریڈیو نشریات کے ابتدائی دنوں میں ڈائریکٹر جنرل پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف کی جانب سے جاری کردہ وائرلیس ریسیور لائسنس کے عوض حاصل شدہ آمدنی کا ۸۰ فیصد حصہ انگریزی حکومت کو لازمی طور پر ادا شدنی تھا۔ سرکاری خزانہ پر بڑھتے بوجھ میں کمی کے مقصد سے

آصفیہ حکومت نے ریاست کے لئے حاصل کردہ لائسنس کو ہندوستان کے کسی دوسرے حصّہ میں استعمال کرنے کی اجازت طلب کی لیکن انگریزی حکومت نے اجازت دینے سے انکار کرتے ہوئے ہندوستان کے دیگر علاقوں میں وائرلیس سیٹس اور آلات کی سپلائی کے لئے ڈائریکٹر جنرل پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف سے علیحدہ لائسنس حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ ریڈیو نشریات کے ابتدائی دور میں براڈ کاسٹ ریسیور لائسنس فیس ۱۲ روپے مقرر کی گئی جس میں سے ۱۰ روپے براڈ کاسٹنگ کمپنی کو ادا شدنی تھے۔ کچھ عرصہ بعد فیس اور کمیشن میں کمی کرتے ہوئے اسے بالترتیب ۱۰ روپے اور ۸ روپے کیا گیا۔ ۲

۱۹۳۹ میں حیدرآباد ریاست کے اس ریڈیو اسٹیشن کو سرکاری طور پر دکن ریڈیو کا نام دیا گیا۔ دکن ریڈیو کے حیدرآباد اسٹیشن سے روزانہ شام ساڑھے پانچ بجے تا رات دس بجے تک نشریات کا سلسلہ جاری رہتا۔ دکن ریڈیو سے نشر ہونے والے پروگرامس کا شیڈول ذیل میں درج ہے۔ ۳

پروگرام نشرگاہ لاسلکی حیدرآباد دکن (چہارشنبہ)

(۲۷/امرداد ۱۳۵۰ فصلی م ۲/جولائی ۱۹۴۱ء)

ساعت شام:

۵:۳۰ : باپوراؤ۔ استادی موسیقی

۵:۵۰ : زہرہ جان انبالہ والی۔ عام پسند موسیقی

۶:۱۰ : باپوراؤ۔ استادی موسیقی

۶:۲۵ : وٹھل راؤ۔ بھجن

۶:۳۵ : زہرہ جان انبالہ والی۔ عام پسند نغمے

۷ تا ۷:۳۰ : بچوں کا پروگرام، گانا، جادو۔ تقریر

ریکارڈز، نظم خوانی۔ امیر احمد صاحب خسرو

نغمہ۔ وینوگوپال

۷:۳۰ : تاریخ ہند کی بڑی ہستیاں سلسلہ (۱۴)

مذہبی مصلح سلسلہ (۵)

گروگوبند سنگھ تقریر

۷:۴۵ : باپوراؤ۔ عام پسند نغمہ

ساعت شب:

۸:۰۰ : اُردو خبریں

۸:۲۰ : انگریزی خبریں

۸:۴۵ : زہرہ جان انبالہ والی۔ عام پسند موسیقی

۹:۰۵ : باپوراؤ۔ ٹُھمری

۹:۲۵ : زہرہ جان انبالہ والی۔ عام پسند موسیقی

۹:۵۵ : اُردو خبریں یا ریکارڈ

۱۰:۰۰ : دعائے سلامتی

ریڈیو نشریات کا اختتام

دکن ریڈیو سے نشر ہونے والے پروگراموں کی تفصیلات سے یہ بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ آصفیہ حکومت، دیگر مذاہب اور انکے جذبات کا احترام کرتی تھی۔ مسلمانوں کے مذہبی پروگراموں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے بھجن اور سکھوں

کے مذہبی گروکی تقاریر کو آصفیہ حکومت نے ریڈیو نشریات کا حصّہ بنایا تھا۔ دکن ریڈیو کے ذریعہ 'تاریخ ہند کی بڑی ہستیاں' کے زیر عنوان ہندوستان کی تاریخی شخصیات کے کارناموں کو سلسلہ وار طور پر نشر کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ نظم خوانی جیسے ادبی اور موسیقی جیسے تفریحی پروگراموں کے علاوہ اُردو، انگریزی خبریں بھی نشر کی جاتیں۔ ریڈیو نشریات کے اختتام پر گلوکار رایف رؤف کی آواز میں آصف سابع میر عثمان علی خان کی مداحی میں ترانہ نشر کیا جاتا۔ جس کے ابتدائی بول درج ذیل ہیں۔

تا ابد خالق عالم یہ ریاست رکھے
تجھ کو عثمان بصد اجلاس سلامت رکھے

سقوط حیدرآباد کے بعد اس میں ہندی سروس کے اضافہ کے ساتھ کچھ عرصہ تک دکن ریڈیو کے نام سے ہی نشریات کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی دنیا کی معروف شخصیت مرحوم منظور الامین نے دکن ریڈیو میں بھی بطور ٹاک پروڈیوسر گراں قدر انجام دی تھیں۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو کے دوران دکن ریڈیو کے حوالے سے کچھ اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ۴

۱۹۴۸ سے پہلے چونکہ آصف جاہی ریاست مملکت محروسہ سرکارِ عالی کہلاتی تھی اور دکن ریڈیو کی نشریات ریاست میں ہی محدود تھیں' اس لئے اس کے پروگرام بھی زیادہ تر اس مقصد سے ہوتے تھے، لیکن بعد میں ہندوستان کی دیگر ریاستوں کی بھی بات ہونے لگی چونکہ نام کے ساتھ مسلمانوں کا جذباتی لگاؤ تھا اس لئے کچھ سالوں تک اسے بدلا نہیں گیا۔ مانا کہ تلگو والے اسکو آکاش وانی اور مراٹھی سروس میں اسکو نبھونی کہا جانے لگا لیکن اُردو اور انگریزی سروس پر یہ دکن ریڈیو ہی کہلاتا تھا' اُردو کا کافی چلن تھا۔ فائلوں پر نوٹنگ اُردو میں ہی ہوتی تھی۔ انگریزی کے پروگراموں کے ٹیپ پر بھی اُردو میں لکھا جاتا تھا۔ ۱۹۵۵ تک آڈٹ بھی اُردو میں ہوتی رہی۔ سقوط حیدرآباد کے بعد رونما ہوتی تبدیلیوں کے باعث دو سال بعد یعنی ۱۹۵۰ میں دکن ریڈیو کے نام کو بھی بالآخر آکاش وانی میں تبدیل کر دیا گیا۔

☆☆☆

حوالہ جات :

۱۔ فائل نمبر۔ ایچ ۱۰۔ سی ۱۷۱، انسٹالمینٹ نمبر۔ ۱۵، لسٹ نمبر۔ ۱۔ تلنگانہ اسٹیٹ آرکائیوز۔
۲۔ فائل نمبر۔ کیو ۷۔ ڈی ۶۲، انسٹالمینٹ نمبر۔ ۳۶، لسٹ نمبر۔ ۶۔ تلنگانہ اسٹیٹ آرکائیوز۔
۳۔ روزنامہ رعیت، ۲؍جولائی ۱۹۴۱۔
۴۔ منظور الامین کا خصوصی انٹرویو، روزنامہ اعتماد ۱۷؍ڈسمبر ۲۰۰۶۔

oOo

محمد عقیل احمد (عقیل دانش)
پی ایچ۔ ڈی ریسرچ اسکالر' عثمانیہ یونیورسٹی
مکان نمبر۔ 10-1-913/912
اے۔ سی گارڈز' خیرت آباد
حیدرآباد۔ 500004
موبائل نمبر۔ 8686613399

قطب شاہی دور میں بچوں کے ادب کی نمائندگی

اگر چہ بچوں کے ادب اور اُس کے تقاضے بنیادی طور پر قصے، کہانی اور حکایات کے علاوہ بے شمار سبق آموز واقعات سے وابستہ تمام سادہ زبان اور ادب میں لکھی ہوئی تحریروں کو اُن کی خصوصیات کی وجہ سے بچوں کے ادب میں شامل کیا جاتا ہے، عادل شاہی دور میں ہی نہیں بلکہ قطب شاہی دور میں بھی اُردو کے شاعروں اور ادیبوں نے دکنی زبان میں ایسی کتابیں لکھیں، جن میں نصیحت آموزی اور مذہبی خصوصیات کے علاوہ اخلاقی خصوصیات کو بھی شامل کیا گیا۔ چنانچہ دکنی زبان کے توسط سے بچوں کے ادب کی نمائندگی کرنے والے عادل شاہی دور کے بعد قطب شاہی دور کو بھی اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ گولکنڈہ اور اُس کے اطراف واکناف میں دکنی ادب پروان چڑھنے لگا تو دکنی کے ادیبوں نے ایسے اظہار کو مناسب سمجھا جس میں مذہبی فلسفہ کے علاوہ اسلامی تصوف اور فقہ کی باتوں کے ساتھ ساتھ پند و موعظت بھی شامل ہو، اس لیے دکنی میں لکھی جانے والی ایسی تمام کتابوں کو بچوں کے ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔ بہمنی دور کے بعد عادل شاہی دور کے شاعروں نے بچوں کے ادب کی نمائندگی کی اور اُس کے بعد قطب شاہی دور میں بھی دکنی میں بچوں کے ادب کو پیش کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ قطب شاہی سلطنت کا آغاز 1525ء میں ہوا، جس کے 8 بادشاہ دکن پر حکمران رہے اور 1687ء میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے حملہ کی وجہ سے گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اگر چہ قطب شاہی دور کے بادشاہ خود دکنی کے شاعر رہے جیسے سلطان محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کی بھی دکنی شاعری کی خصوصیت کو اپنے کلام میں شامل کیا اور اس دور میں دکنی کے دو بڑے شعراء ملا وجہی اور غوّاصی کو عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے ملک الشعراء کا خطاب دیا گیا۔ اُس دور کے 32 شاعروں کے ذریعہ مثنوی، قصیدہ، غزل، مرثیہ، رُباعی جیسی شعری دوسری اصناف کو ترقی حاصل ہوئی جس کے ساتھ ہی بچوں کے ادب پر توجہ دینے والے قطب شاہی دور کے اہم ادیبوں کے نام اور اُن کے کارنامے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

میراں جی حسن خدا نما (وفات: 1078ھ م 1667ء) کو قطب شاہی دور کے اہم بچوں کے نثر نگار کا درجہ حاصل ہے۔ اُنہوں حضرت امامِ غزالی کے بھائی شیخ احمد کی لکھی ہوئی کتاب ''شرح تمہید ہمدانی'' کا اُردو میں ترجمہ کیا، یہ کتاب سلیس دکنی زبان میں لکھی ہوئی ہے اور اس کی نثر انتہائی سادہ اور آسان ہے، جس میں بچوں کے ادب کی خصوصیت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اُن کی نثر کا نمونہ پیش ہے:

''اللہ بڑا صاحب ہے، اُس کو بہت سراہنا، ہور بہت نوازنا۔۔۔۔خدا دائم قائم ہے، اُس کی بندگی کا مہر سب پر ہے، ہور خدا اکیلا ہے، پیدا کرتا ہے، ہور مارتا ہے''۔

مضامین

میراں جی حسن خدا نما ایک صوفی بزرگ تھے جنھوں نے بچوں کی تربیت اور اُنہیں خدا کی ذات کی پہچان کے لیے یہ رسالہ لکھا، جس میں خدا کی بڑائی کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں پیش کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے اُن کی نثر رواں اور سلیس ہوگئی ہے، اسی لیے قطب شاہی دور کے اولین بچوں کے نثر نگار کی حیثیت سے میراں جی حسن خدا نما کا نام پیش کیا جاتا ہے، جن کے بعد مولانا عبداللہ نامی نثر نگار قطب شاہی دور کے آخری بادشاہ کے زمانے کے بزرگ نے 1032ھ (1614ء) میں مشہور کتاب ''احکام الصلوۃ'' لکھی، جسے فارسی سے اُردو میں ترجمہ قرار دیا جاتا ہے، اس کتاب میں مختصر فقہ حنفی کی نمائندگی کی گئی ہے۔ بچوں کو حنفی طریقہ سکھانے کے لیے یہ کتاب بڑی مفید ہے، زبان آسان ہونے کے باوجود دکنی میں لکھی جانے کی وجہ سے اُس کا مطالعہ آج کے دور میں سخت دشوار ہے، غرض قطب شاہی دور کے دوسرے بچوں کے نثر نگار کی حیثیت سے مولانا عبداللہ کا نام لیا جاتا ہے، جنھوں نے حنفی فقہ کو آسان زبان میں لکھ کر بچوں کی تربیت کا حق ادا کیا۔

قطب شاہی دور میں جس وقت مولانا عبداللہ دینی کتابوں کی تحریر کے ذریعہ بچوں کے ادب میں اضافہ کر رہے تھے، اُسی دور میں دکنی کے مشہور شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے عابد شاہ کا نام کافی شہرت رکھتا ہے، اُنہوں نے شاعری میں ''گلزار السالکین''، جیسی کتاب لکھی اور نثر میں ''کنز المومنین'' تحریر کی جو حنفی مسائل کی نمائندگی کرتی ہے، اس میں بھی سمجھانے والا انداز شامل ہے، اسی لیے اس کتاب کو قطب شاہی دور کی بچوں کے ادب ایک اہم کتاب کا درجہ حاصل ہے۔

قطب شاہی دور کے بیشتر شاعروں اور ادیبوں نے نثر کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی مذہب پرستی کے مواد کو پیش کر کے زبان کی خدمت اور بچوں کے ادب کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔ ایسے ہی قطب شاہی دور کے ایک اہم شاعر سید بلاقی گذرے ہیں جنھوں نے دکنی زبان میں ''معراج نامہ'' تحریر کیا جو فارسی زبان کا اُردو میں ترجمہ ہے۔ یہ کتاب 1065ھ (1654ء) میں لکھی گئی، جو حیدرآباد کے کتب خانوں کے علاوہ یوروپ کے کتب خانوں میں موجود ہے۔ اس کتاب میں داستانی انداز سے معراج کا واقعہ پیش کیا گیا ہے، جس میں ایک یہودی کے انکار کا جواز پیش کیا گیا ہے۔

قطب شاہی دور کے آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ کے زمانے میں دکنی کا باوثوق شاعر اولیاء گذرا ہے، جس نے 1090ھ مطابق 1679ء میں فارسی ''معراج نامہ'' کو دکنی میں منتقل کیا، اس طرح حضرت عمرؓ کے فرزند ابوشحمہ کے قصے کو اُس زمانے کی خصوصیات کے ساتھ پیش کیا ہے، قطب شاہی دور سے وابستہ شاعروں نے بچوں کے ادب کی نمائندگی کی، جس میں اولیاء کا لکھا ہوا قصہ ابوشحمہ بھی شامل ہے، جس میں بچوں کے ادب کی خصوصیات شامل ہیں، خود قطب شاہی کے آخری بادشاہ کی حیثیت سے ابوالحسن تانا شاہ نے بھی بچوں کے ادب کی طرف خصوصی توجہ دی، تانا شاہ کے مرشد حضرت سید شاہ راجو قتال حسینی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوالحسن تانا شاہ کو بہترین تربیت دی۔ غرض ابوالحسن تانا شاہ اور شاہ راجو قتال حسینی رحمۃ اللہ علیہ نے

بھی بچوں کے ادب کی خدمت انجام دی۔

قطب شاہی دور کے چھٹویں بادشاہ محمد قلی قطب شاہ معانی نہ صرف بادشاہ تھے بلکہ بچوں کے ادب کے شاعر بھی تھے، جنہیں حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اُردو کے بچوں کے دوسرے شاعر ہونے کا شرف حاصل ہے، سلطان قلی دکنی کا شاعر اور صوفی منش بزرگوں کی خدمت کیا کرتا تھا، اُس کا وہی دور ہے جب شمالی ہند میں اکبر اعظم حکمران تھا، سلطان محمد قلی نے عوام کے رسم ورواج، تہذیب وتمدن اور تہوار کے علاوہ کھیل کود سے دلچسپی دکھائی، چنانچہ اُس کی شاعری میں رنگا رنگ شعری خصوصیات جلوہ گر ہیں، قلی قطب شاہ کا انتقال 1611ء میں ہوا، اُس نے بچوں کے ادب کی ترقی وترویج کے لیے موسموں اور تیوہاروں پر ہی نہیں، بلکہ کھیل کود اور لڑکیوں کی دلچسپی کے کھیلوں پر نظمیں لکھیں، اُسے اُردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔غرض دکنی زبان میں سب سے زیادہ بچوں کے ادب کی تحریروں کے ذریعہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اہم کارنامے انجام دیئے اوران کارناموں میں تنوع بھی پایا جاتا ہے۔اس طرح اُس کی شاعری میں رنگین بیانی جلوہ گر نظر آتی ہے۔سلطان قلی قطب شاہ نے شب برأت، بقرعید، پوریوں کی عید، عید نوروز، عید غدیر، ہولی، بسنت، دیوالی اور عید الفطر کے علاوہ کئی کھیلوں اور دلچسپیوں اور محلوں پر بھی نظمیں لکھیں، جس کی وجہ سے وہ اپنے عہد کا مشہور دکنی اور بچوں کا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔اس طرح قطب شاہی دور میں بچوں کے ادب کی آبیاری کے لیے شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ''کلیات محمد قلی'' میں 50 ہزار اشعار موجود ہیں، اس طرح گولکنڈہ میں قائم قطب شاہی حکومت کے ذریعہ بھی دکنی شاعروں نے بچوں کے ادب کی نمائندگی کرتے ہوئے دکنی باشندوں کی خدمت انجام دی۔اس طرح بہمنی اور عادل شاہی دور کے بعد بچوں کے ادب کو پروان چڑھانے میں قطب شاہی دور کے بادشاہوں اور عوام پسند شاعروں نے دکن کے علاقے میں پھیلنے والی اُردو زبان کی سرپرستی کی اور بچوں کے ادب کو امتیازی مقام عطا کیا، اس طرح دکن میں شاہی سرپرستی اور عوام کی دلچسپی کی وجہ سے بچوں کے ادب کو پروان چڑھنے کا موقع حاصل ہوگیا، جب مغلیہ شہنشاہ اورنگ زیب نے دکن کی پانچ مسلم حکومتوں کا خاتمہ کردیا تو بھی دکنی ادب جاری رہا اور دکنی ادیبوں نے ان کی آبیاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1347ء سے لے کر 1687ء تک دکنی ادب میں بچوں کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے طریقے استعمال کئے جاتے رہے، جس کے بعد مغلیہ دور کے بادشاہوں کی جانب سے دکن کے مقامی باشندوں پر حملوں کی وجہ سے دکنی خصوصیات روبہ زوال ہوئیں۔اور پھر دکن میں مغلیہ سلطنت کی وجہ سے اُردو میں بچوں کے ادب میں نیا رجحان عام ہوا۔ مغلیہ سلطنت کے بادشاہ اورنگ زیب کے حملہ کے بعد دکن کی پانچ سلطنتیں روبہ زوال ہوئیں اور مغلیہ دور کا آغاز ہوا۔اس کے بعد بھی شہر اورنگ آباد سے دکنی بچوں کے ادب کی خصوصیات جاری رہیں۔

☆☆☆

محمد رفیع الدین، ریسرچ اسکالر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ
مکان نمبر 2-10-1، پھولانگ، نظام آباد 503001
موبائل: 9912871502

مضامین

ضلع ورنگل کے چند نامور شعراء

ورنگل شہر تاریخی اہمیت کا حامل شہر ہے۔ کاکتیہ حکمرانوں کا یہ صدر مقام تھا۔ آج بھی عالی شان عمارتیں ومنادر جیسے ہزار ستون دیول، قلعہ ورنگل، حکمرانوں کی یاد دلاتے ہیں۔ جب کاکتیہ سلاطین کے آخری بادشاہ کو مسلمانوں کے ہاتھوں شکست ہوئی تب سے مسلمان اس تاریخی شہر میں آباد ہوئے اور یہاں فارسی اور اردو شعر وادب کی شروعات ہوئی۔

سب سے پہلا نام ادب کی دنیا میں جو ہمیں ملتا ہے وہ حضرت سید شاہ فاضل بیابانیؒ (ورنگل قاضی پیٹ درگاہ شریف) کا ملتا ہے۔ جنھوں نے فارسی زبان میں ایک کتاب تخلیق کی جو مسلمانوں کی مذہبی رہبری اور رہنمائی پر مشتمل تھی۔ اس کے بعد حضرت سید شاہ افضل بیابانیؒ کا کلام دستیاب ہے۔

تاریخی شہر ورنگل (ہنمکنڈہ) کی سرزمین سے کئی قابل قدر شعری وادبی شخصیتیں نمودار ہوئیں۔ جنھوں نے شعر وادب میں گنج ہائے گراں مایہ ناز کارنامے انجام دیئے۔ سرزمین ورنگل میں ان دنوں بے شمار شعراء وادیب اردو زبان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ ان میں چند شاعر وادیب دینی ومذہبی کلام پیش کئے اور چند نے اردو ادب میں اپنا اچھا کلام پیش کیا۔ کچھ کا ذکر یہاں ہم کئے دیتے ہیں۔

ورنگل کے شعراء:

اقبال شیدائی، نادر اُسلوبی مرحوم، علی الدین گوہر مرحوم، محمد عثمان ورنگلی، ڈاکٹر عزیز احمد عرسی، اجمل محسن ایڈوکیٹ، تاج مضطر، ڈاکٹر مبشر احمد نشتر، مسعود مرزا محشر، اقبال درد، پروفیسر احمد حسین خیالی، وحید گلشن (صحافی وشاعر)، اندور عبدالقادر نقشبندی۔

ورنگل کے ادیب، افسانہ نگار:

فضل جاوید، محمد سرور علی افسر، ڈاکٹر محمد بہادر علی، ڈاکٹر عزیز احمد عرسی، اجمل محسن، مسعود مرزا محشر۔

اقبال شیدائی: اقبال شیدائی کا پورا نام محمد مشید الدین ہے۔ ان کے والد کا نام محمد جلال الدین ہے۔ ان کی ولادت ۱۵؍فبروری ۱۹۴۳ء کو ورنگل میں ہوئی۔ وہ سرکاری محکمہ میں منڈل پریشد ڈیولپمنٹ آفیسر کے عہدہ سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے ہیں۔ انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی ایس سی کی ڈگری حاصل کی ہے۔

اقبال شیدائی نہ صرف شاعری میں ذوق رکھتے ہیں بلکہ طنز ومزاح کے مضامین اور خاکہ نگاری بھی بہترین انداز میں کرتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں کہیں بھی جھول نہیں ہوتا۔ ان کے افسانے یا مضامین پڑھتے ہوئے قارئین کو ایک پل بھر بھی بوریت محسوس نہیں ہوتی کیونکہ شیدائی اسے اپنی دلچسپ ڈور سے باندھے

رکھتے ہیں۔ اقبال شیدائی کا مطالعہ کافی وسیع ہے۔ سیاست سے بھی انھیں گہری دلچسپی ہے۔ سیاسی موضوعات پر اپنا قلم چلا کر مکروہ سیاسی چہرہ کو ننگا کرنا انھیں خوب آتا ہے۔ ایسا کر کے وہ کسی کو خوش کرتے ہوں یا نہیں مگر خود بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''مولوی ابوالحسن کا چوکرہ'' میرے خیال کی ایک عمدہ مثال ہے۔

اقبال شیدائی کا شعری مجموعہ ''آتش سیال'' کی طرح ان کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ ''جامہ تلاشی'' بھی ہے۔ روزنامہ منصف کے کالم نگاروں میں بعض بہت کڑوا کسیلا طنز شکر کی گولیوں کی طرح پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ایسا لکھنے والوں میں اقبال شیدائی کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ طنز نگاری کے ساتھ شاعری بھی کرتے ہیں اور افسانہ بھی لکھتے ہیں۔ اقبال شیدائی کی دیگر کتابیں اس طرح ہیں:

(۱) آتش سیال (شعری مجموعہ) سال ۱۹۹۶ء (۲) جامہ تلاشی (طنزیہ مضامین) سال ۲۰۰۵ء (۳) خواب جاگتی آنکھوں کے (شعری مجموعہ) سال ۲۰۰۶ء، (۴) بوند میں جکڑا طوفان (بارہ سو غزلیات کا مجموعہ) سال ۲۰۰۷ء (۵) برکتیں وردی کی (طنزیہ افسانوں کا مجموعہ) سال ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئیں ہیں۔ جبکہ زیر ترتیب کتابوں میں (۱) صنم ہوتم آقا (نعتیہ کلام)، (۲) آڑی کی بلا باڑی پر شامل ہیں۔

شاعری کے زمرہ میں اردو اکیڈیمی کی جانب سے سعید شہیدی کارنامہ حیات ایوارڈ چیف منسٹر آنجہانی ڈاکٹر وائی ایس راج شیکھر ریڈی کے ہاتھوں ۲۱؍ جولائی ۲۰۰۹ء کو دیا گیا' ان کی تین کتابوں ' جامہ تلاشی' ،' خواب جاگتی آنکھوں کے اور ' بوند میں جکڑا طوفان' کو بھی آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی حیدرآباد نے انعامات سے نوازا ہے۔

ڈاکٹر محمد بہادر علی: ڈاکٹر محمد بہادر علی (قلمی نام) ہے۔ ان کا اصلی نام محمد بہادر علی ہے۔ ان کے والد کا نام جناب محمد جعفر علی ہے۔ ان کی پیدائش ۸؍ جنوری ۱۹۴۷ء کو ورنگل میں ہوئی۔ یہ ایک اچھے ادیب ہیں۔ ان کی تعلیمی قابلیت ایم۔ اے (سیاسیات) ، ایم ۔ اے (اردو)، بی ایڈ اورانہوں نے پی ایچ۔ ڈی عثمانیہ یونیورسٹی سے مکمل کی ہے۔ اسلامیہ آرٹس اینڈ سائنس کالج ورنگل کے وظیفہ یاب پرنسپل ہیں اور اب بھی اسی کالج میں سیاسیات اور اردو کے پارٹ ٹائم لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پی ایچ۔ ڈی میں ان کا موضوع ''اردو ناول۔ تکنیک اور رجحانات'' تھا۔ ان کی تصانیف جو منظر عام پر آئیں ہیں ان میں (۱) عظیم سیاسی مفکرین (۹۲) دستورِ ہند اور عملی سیاست (۳) اردو ناول۔ رجحانات وتحریکات (تحقیق وتنقید پر مبنی) نہ صرف مقبول ہوئیں بلکہ اس تصنیف کو رانچی یونیورسٹی جھارکھنڈ نے بطور حوالا جاتی کتاب ایم۔ اے اردو کے نصاب میں شامل کیا ہے۔ ان کی دوسری تصنیف ''اردو ناول ایک تکنیکی جائزہ'' نے بھی کافی پذیرائی حاصل کی اور ان دونوں تصانیف پر ملک اور بیرون ملک کے نامور ادیب و مصنفین نے اپنے ستائشی آراء کا اظہار کیا ہے۔ ''اردو ناول ایک مطالعہ'' کے زیر عنوان ان کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے منتخبہ ممتاز ناول نگاروں کے فن

کی خصوصیات اور تکنیک پر اپنے تنقیدی مضامین کو شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر بہادر علی کی ایک اور کتاب کا نام منشی پریم چند اور گاندھیائی تحریک'' ہے جو کہ سال ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی ہے۔اردو ناول ایک تکنیکی جائزہ'' پر اردو اکیڈیمی آندھراپردیش نے تحقیق وتنقید کے میدان میں ان کو انعام اول کا مستحق قرار دیا ہے۔اس سے قبل ان کی پہلی کتاب اردو ناول تحریکات ور جحانات پر بھی اردو اکیڈیمی اے پی نے انعام سے سرفراز کیا تھا۔ ورنگل شہر میں جو بھی مشاعرے ہوتے ہیں اکثر و بیشتر کی صدارت کا انھیں اعزاز حاصل ہے۔

نادر اُسلوبی: پیدائشی نام غلام علی شاہ قادری اور ادبی و قلمی نام نادر اُسلوبی ہے۔ان کی پیدائش ۱۵/اگست ۱۹۳۵ء کو حیدرآباد میں ہوئی جو کہ ریاست آندھراپردیش کے ضلع ورنگل کے کہنہ مشق بزرگ شاعر ہیں۔ آپ مہندی مبارک حضرت غوث پاک کے واسع بازار گھانسی کے سجادہ نشین ہیں۔ ورنگل ان کا وطن ثانی ہے۔آپ گذشتہ چالیس پینتالیس سال سے اردو زبان وادب کی بے لوث خدمات انجام دے رہے ہیں۔ نادر اُسلوبی بطور شخص ایک مخلص، صاحب کردار اور پاک وصاف دل رکھتے ہیں۔ بڑوں کی عزت اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے پیش آنا ان کا وطیرہ خاص ہے۔ جناب نادر اُسلوبی ورنگل کے ادبی حلقوں میں بحیثیت شاعر اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔تقریباً پانچ دہوں سے شعر کہہ رہے ہیں۔غزل کے بہت ہی اچھے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں فرد کی محرومی موجودہ زمانے کا آشوبِ حال و مستقبل کی بے یقینی اور کہیں کہیں عصری حسیت اور کہیں روایتیں بھی سانس لیتی نظر آتی ہیں۔ان کی شاعری بیان کا تجزیہ نہیں بلکہ تجربہ کا اظہار ہے۔ نادر اُسلوبی کی شاعری سادہ وسلیس زبان اور لہجہ کی ندرت کے باعث قارئین وسامعین کو لبھاتی ہے۔ نادر اُسلوبی نعت گو شاعر ہیں۔ ان کے نعتیہ مجموعہ کلام ''ثواب میں داخل'' کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ جس میں انھوں نے سرکار کی شان میں عقیدت واحترام کے ساتھ کلام لکھا ہے۔ جس کے مطالعہ سے نہ صرف ایمان تازہ ہوجاتا ہے بلکہ قلب وروح کو تسکین ہوتی ہے۔ آپ کو فن عروض پر دسترس حاصل ہے۔مختلف اصناف سخن میں اشعار لکھے ہیں۔

نادر اُسلوبی کے دو شعری مجموعوں میں (۱) نوکِ قلم اور (۲) حروفِ دل شامل ہیں۔ ان دونوں کو اے۔ پی اردو اکیڈیمی کے جزوی مالی امداد سے سال ۲۰۰۰ء اور ۲۰۰۵ء کو شائع کیے گئے۔

خواجہ انور حسین: اصل نام انور حیات اور قلمی نام خواجہ انور حسن ہے اور تخلص انوؔر فرماتے ہیں۔ ان کی کتابیں ''شعلہ احساس'' (شعری مجموعہ) اور '' آئینوں کے درمیان (غزلیں) شعری مجموعہ منظر عام پر آئیں ہیں۔ان کے والد کا نام مولوی محمد اسمٰعیل تھا۔ ان کی تاریخ پیدائش ۲/فبروری ۱۹۵۲ء کو ورنگل ضلع میں ہوئی۔ انور حیات میں شعر کی انفرادی خصوصیات علاحدہ طور پر نظر آتی ہیں۔

خواجہ معین الدین عقیل: تاریخی شہر ورنگل (ہنمکنڈہ) کی سرزمین سے کئی قابل قدر شعری وادبی شخصیتیں نمودار ہوئیں ہیں۔ جنھوں نے شعر وادب میں گنج ہائے گراں مایہ کارنامے

انجام دیئے ہیں۔ ان خوش نصیبوں خواجہ معین الدین عقیلؔ بھی شامل ہیں۔ وہ بمقام ہنمکنڈہ ورنگل میں ۱۵/جنوری ۱۹۴۳ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد جمال الدین تھا۔ انھیں بچپن ہی سے شعر وشاعری کا شوق وذوق تھا۔ لیکن ملازمت کی زیر باریوں اور مصروفیت کی وجہ سے اپنے شعری ذوق کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے تاہم وظیفہ حسن خدمت سے سبکدوشی کے بعد پورے انہماک اور خلوص کے ساتھ صنف سخن کی طرف توجہ دیتے ہوئے بہت ہی کم عرصہ میں اپنی الگ پہچان اور شناخت بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ مسلسل کوشش کے بعد اپنا پہلا مجموعہ کلام ''ناؤ کاغذ کی'' وجود میں لایا۔ اس مجموعہ کلام میں ایک حمد (مناجات) تقریباً ۱۲/نعتیں اور بہت سی غزلیات شامل ہیں۔ حضور اکرم ﷺ کی بارگاہ میں عمدہ نعتیں پیش کی ہیں۔ جناب عقیل کی ایک نمایاں خوبی یہ بھی ہے کہ مطالعہ کے وسیلے سے اور کہیں اپنے ذاتی تجربے سے شعر میں جان ڈال دیتے ہیں۔ کلاسکی روایت سے قربت رکھنے کے باوجود ان کی غزلیں غم ذات کے پہلو بہ پہلو غمِ کائنات کی بہترین ترجمان ہیں۔ وارداتِ حسن وعشق کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں عصری حسیت کی تب وتاب خوبصورت انداز میں اپنا جلوہ دکھارہی ہیں۔ عقیل صاحب کو سماجی مسائل سے بھی دلچسپی ہے۔ اختلافی مسائل سے کنارہ کشی کرتے ہوئے اتحاد واتفاق ویکجہتی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ ''ناؤ کاغذ کی'' سال ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا ہے۔

اجمل محسنؔ: اجمل محسن ۸/جون ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا نام اجمل حسین اور قلمی نام 'اجمل محسنؔ' تخلص کرتے ہیں۔ آپ کا تعلق حیدرآباد کے گھرانے سے ہے۔ آباواجداد نظام شاہی دور میں کانپور لکھنؤ سے حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ ان کے والد کا نام سید داؤد حسین تھا جو محکمہ مال سے وابستہ تھے۔ دورانِ ملازمت ضلع در ضلع پھرتے رہے۔

نثر نگاری ایک مشکل اور صبر آزما صنف ادب ہے۔ وقت اور یکسوئی مانتی ہے۔ اسی وجہ سے شعراء کرام کی بہ نسبت ادبا کی تعداد ہر جگہ اور دور میں کم رہی ہے۔ شہر ورنگل کے نثری ادب کے میدان میں پچھلی نصف صدی کے دوران قدم رکھنے والے افسانہ نگاروں میں اجمل محسن بھی شامل ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ''روشِ دوراں'' جملہ ۲۷/افسانوں پر مشتمل ہے۔ اجمل محسنؔ کے دو مجموعہ ایک شعری ''پھول، کانٹے اور خوشبو''، سال ۲۰۰۶ء میں اور ایک نثری ''روش دوراں'' سال ۲۰۰۷ء میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ اجمل محسن سال ۱۹۹۶ء میں بحیثیت شاعر منظر عام پر آئے تھے۔ ان کے افسانے ''اعتبار کا میزان''، ''لوگ الفاظ میں مطلب کو چھپا لیتے ہیں'' اور ''ذہن لوگ ارادہ بھی چھین لیتے ہیں''، منظر عام پر آئے۔

محمد تاج الدین، المعروف تاج مضطر: اصلی نام محمد تاج الدین قلمی وادبی نام (تاج مضطرؔ) ہے۔ مرکزی بزم محمدی ورنگل کے صدر ہیں۔ اردو ادب اور اردو سخن پردازی ایک وسیع سمندر ہے۔ جس میں ڈوب کر گوہر نکال لانا آسان کام نہیں ہے تاہم تاج مضطر سمندر میں ابھی تک گوہر نکالنے میں مصروف ہیں۔

علی الدین گوہر: علی الدین گوہر اپنی ادبی زندگی کا آغاز نثر

سے کیا ہے اور بعد میں شاعری کی طرف مائل ہوئے۔ یہ فطری رجحان کی بات ہے کہ علی الدین گوہر نے شاعری کو اپنے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہے۔ سال ۱۹۷۳ء میں شہر ورنگل میں جدید کاروانِ اردو کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ علی الدین گوہر قلمی نام ہے جب کہ ان کا اصلی نام خواجہ علی الدین احمد ہے۔ اور تخلص گوؔہر فرماتے ہیں۔ پیشہ کے اعتبار سے ریٹائرڈ لکچرر ہیں جو اسلامیہ ڈگری کالج ورنگل سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے ہیں۔ ان کے شاعری میں ''لمحے لہولہو''، ''سرد سناٹے'' اور ''دینی اعتبار سے سراجاً منیرا سلام'' (مجموعہ سلام) شائع ہوئے ہیں۔

محمد سرور علی افسر: محمد سرور علی افسؔر تقریباً ۳۰/سال سے اپنے قلم کے جوہر دکھارہے ہیں۔ ۱۰/اکتوبر ۱۹۳۴ء کو ہنمکنڈہ میں پیدا ہوئے۔ سال ۱۹۶۰ء میں انھوں نے محبوبیہ پنچتن ہائی اسکول مٹھواڑہ ورنگل سے بحیثیت ڈرائنگ ٹیچر ملازمت شروع کی تھی۔ سال ۱۹۷۱ء میں جامع اردو علی گڑھ سے ''ادیب کامل'' پاس کیا۔ پی یو سی اور ۱۹۷۳ء میں بی۔اے۔ ۱۹۷۵ء میں ایم (اردو لٹریچر) ۱۹۸۰ء میں ایم۔اے تاریخ اور ۱۹۸۴ء میں بی ایڈ عثمانیہ یونیورسٹی سے درجہ اول میں کامیاب ہوئے۔ سال ۱۹۸۱ء میں ان کا تقرر بحیثیت لکچرر اسی کالج میں ہوا۔ سال ۱۹۹۲ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اسلامک اسٹڈی اینڈ ریسرچ اکیڈیمی کے سکریٹری ہیں۔ اور کئی ادبی انجمنوں سے وابستہ ہیں۔ ان کی کتاب ''تنقیدی کرنیں'' منظر عام پر آیا ہے۔

صادق احمد صادقؔ: صادق احمد صادقؔ کا پہلا شعری مجموعہ ''زادِ سفر'' کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ وہ بزم نثار، بزم محمدی کے علاوہ تحریک قلم ورنگل کے مشاعروں میں پابندی سے شریک ہوتے ہیں۔ وہ اظہر جعفری مرحوم سے تلامذہ کیا کرتے تھے۔ تعلیمی زمانے سے ہی شاعری کا شوق رہا۔ صادق رضوی قلمی نام ہے۔ ان کا شعری مجموعہ ''زادِ سفر'' سال ۲۰۰۷ء کو شائع ہوا۔

سلطان حمید الم: حضرت سلطان حمید الم ضلع ورنگل کے موجودہ شعرائے کرام میں سب سے بزرگ شاعر ہیں۔ نام سلطان حمید ہے۔ تخلص ''آلم'' اور قلمی نام سلطان حمید آلم ہے۔ ۸/ستمبر ۱۹۲۹ء کو قلعہ ورنگل میں پیدا ہوئے۔ وہ محکمہ جنگلات سے منتظم کے عہدہ سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے ہیں ان کی کتاب کا نام ''رقص شرر'' ہے جو سال ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی اس کتاب کا موضوع شاعری ہے۔ رقصِ شرر کا بڑا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ چند نعتیں ہیں۔ یقیناً قابل قدر ہیں اور مقبولیت کی حامل ہیں۔ ادبی شاعری، ندرتِ خیال، شگفتہ مزاجی اور برجستگی سے ان کی منفرد پہچان ہے۔ آلم نے فن وجذبات کی بدولت شعری میں اپنا خصوصی مقام بنایا ہے۔

☆☆☆

آمینہ اختر' ایم۔اے، یوپی ٹی
پی ایچ۔ڈی (اردو) ریسرچ اسکالر، عثمانیہ یونیورسٹی
Phone No. 8096669782

مضامین

ماں جی

ماں جی کی پیدائش کا صحیح سال معلوم نہیں ہو سکا۔

جس زمانے میں لائل پور کا ضلع نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ پنجاب کے ہر قصبے سے غریب الحال لوگ زمین حاصل کرنے کے لئے اس نئی کالونی میں جوق در جوق کھنچے چلے آ رہے تھے۔ عرف عام میں لائل پور، جھنگ، سرگودھا وغیرہ کو ''بار'' کا علاقہ کہا جاتا تھا۔

اس زمانے میں ماں جی کی عمر دس بارہ سال تھی۔ اس حساب سے ان کی پیدائش پچھلی صدی کے آخری دس پندرہ سالوں میں کسی وقت ہوئی ہوگی۔

ماں جی کا آبائی وطن تحصیل روپڑ ضلع انبالہ میں ایک گاؤں منیلہ نامی تھا۔ والدین کے پاس چند ایکڑ اراضی تھی۔ ان دنوں روپڑ میں دریائے ستلج سے نہر سرہند کی کھدائی ہو رہی تھی۔ نانا جی کی اراضی نہر کی کھدائی میں ضم ہو گئی۔ روپڑ میں انگریز حاکم کے دفتر سے ایسی زمینوں کے معاوضے دیئے جاتے تھے۔ نانا جی دو تین بار معاوضے کی تلاش میں شہر گئے۔ لیکن سیدھے آدمی تھے۔ کبھی اتنا بھی معلوم نہ کر سکے کہ انگریز کا دفتر کہاں ہے اور معاوضہ وصول کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ انجام کار صبر و شکر کر کے بیٹھ گئے اور نہر کی کھدائی کی مزدوری کرنے لگے۔

انہی دنوں پرچہ لگا کہ بار میں کالونی کھل گئی ہے اور نئے آبادکاروں کو مفت زمین مل رہی ہے۔ نانا جی اپنی بیوی، دو ننھے بیٹوں اور ایک بیٹی کا کنبہ ساتھ لے کر لائل پور روانہ ہو گئے۔ سواری کی توفیق نہ تھی۔ اس لئے پا پیادہ چل کھڑے ہوئے۔

راستے میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے۔ نانا جی جگہ بہ جگہ قلی کا کام کر لیتے یا کسی ٹال پر لکڑیاں چیر دیتے۔ نانی اور ماں جی کسی کا سوت کات دیتیں یا مکانوں کے فرش اور دیواریں لیپ دیتیں۔ لائل پور کا صحیح راستہ کسی کو نہ آتا تھا جگہ جگہ بھٹکتے تھے اور پوچھ پاچھ کر دنوں کی منزل ہفتوں میں طے کرتے تھے۔

ڈیڑھ دو مہینے کی مسافت کے بعد جڑانوالہ پہنچے۔ پا پیادہ چلنے اور محنت مزدوری کی مشقت سے سب کے جسم نڈھال اور پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ یہاں پر چند ماہ قیام کیا۔ نانا جی دن بھر غلہ منڈی میں بوریاں اٹھانے کا کام کرتے۔ نانی پرچہ کات کر سوت بیچتیں اور ماں جی گھر سنبھالتیں جو ایک چھوٹے سے جھونپڑے پر مشتمل تھا۔

انہی دنوں بقر عید کا تہوار آیا۔ نانا جی کے پاس چند روپے جمع ہو گئے تھے۔ انہوں نے ماں جی کو تین پیسے بطور عیدی دیئے۔ زندگی میں پہلی بار ماں جی کے ہاتھ اتنے پیسے آئے تھے۔ انہوں نے بہت سوچا لیکن اس رقم کا کوئی مصرف ان کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ وفات کے وقت ان کی عمر کوئی اسی برس کے لگ بھگ تھی۔ لیکن ان کے نزدیک سو روپے، دس روپے،

پانچ روپے کے نوٹوں میں امتیاز کرنا آسان کام نہ تھا عیدی کے تین آنے کئی روز ماں جی کے دوپٹے کے ایک کونے میں بندھے رہے۔ جس روز وہ جڑانوالہ سے رخصت ہو رہی تھیں ماں جی نے گیارہ پیسے کا تیل خرید کر مسجد کے چراغ میں ڈال دیا۔ باقی ایک پیسہ اپنے پاس رکھا۔ اس کے بعد جب کبھی گیارہ پیسے پورے ہو جاتے تو وہ فوراً مسجد میں تیل بجھوا دیتیں۔

ساری عمر جمعرات کی شام کو اس عمل پر بڑی وضعداری سے پابند رہیں۔ رفتہ رفتہ بہت سی مسجدوں میں بجلی آ گئی۔ لیکن لاہور اور کراچی جیسے شہروں میں بھی انہیں ایسی مسجدوں کا علم رہتا تھا جن کے چراغ اب بھی تیل سے روشن ہوتے تھے۔

وفات کی شب بھی ماں جی کے سرہانے ململ کے رومال میں بندھے ہوئے چند آنے موجود تھے۔ غالباً یہ پیسے بھی مسجد کو تیل کے لئے جمع کر رکھے تھے۔ چونکہ وہ جمعرات کی شب تھی۔

ان چند آنوں کے علاوہ ماں جی کے پاس نہ کچھ اور رقم تھی اور نہ کوئی زیور۔ اسباب دنیا میں ان کے پاس گنتی کی چند چیزیں تھیں۔ تین جوڑے سوتی کپڑے، ایک جوڑا دیسی جوتا، ایک جوڑا ربڑ کے چپل، ایک عینک، ایک انگوٹھی جس میں تین چھوٹے چھوٹے فیروزے جڑے ہوئے تھے۔ ایک جائے نماز، ایک تسبیح اور باقی اللہ اللہ۔

پہننے کے لئے تین جوڑوں کو وہ خاص اہتمام سے رکھتی تھیں۔ ایک زیب تن، دوسرا اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھا رہتا تھا تاکہ استری ہو جائے۔ تیسرا دھونے کے لئے تیار۔ ان کے علاوہ اگر چوتھا کپڑا ان کے پاس آتا تھا تو وہ چپکے سے ایک جوڑا کسی کو دے دیتی تھیں۔ اسی وجہ سے ساری عمر انہیں سوٹ کیس رکھنے کی حاجت محسوس نہ ہوئی۔ لمبے سے لمبے سفر پر روانہ ہونے کے لئے انہیں تیاری میں چند منٹ سے زیادہ نہ لگتے تھے۔ کپڑوں کی پوٹلی کی بکل ماری اور جہاں کہے چلنے کو تیار۔ سفر آخرت بھی انہوں نے اسی سادگی سے اختیار کیا۔ میلے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر تکیے کے نیچے رکھے۔ نہا دھو کر بال سکھائے اور چند ہی منٹوں میں زندگی کے سب سے لمبے سفر پر روانہ ہو گئیں۔ جس خاموشی سے عقبیٰ سدھار گئیں۔ غالباً اس موقع کے لئے وہ اکثر یہ دعا مانگا کرتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ ہاتھ چلتے چلاتے اٹھا لے۔ اللہ کبھی کسی کا محتاج نہ کرے۔

کھانے پینے میں وہ کپڑے لتے سے بھی زیادہ سادہ اور غریب مزاج تھیں۔ ان کی مرغوب ترین غذا مکئی کی روٹی، دھنیے پودینے کی چٹنی کے ساتھ تھی۔ باقی چیزیں خوشی سے تو کھا لیتی تھیں لیکن شوق سے نہیں۔ تقریباً ہر نوالے پر اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں۔ پھلوں میں کبھی بہت مجبور کیا جائے تو کبھی کبھار کیلے کی فرمائش کرتی تھیں۔ البتہ ناشتے میں چائے دو پیالے اور تیسرے پہر سادہ چائے کا ایک پیالہ ضرور پیتی تھیں۔ کھانا صرف ایک وقت کھاتی تھیں۔ اکثر و بیشتر دوپہر کا۔ شاذ و نادر رات کا۔ گرمیوں میں عموماً مکھن نکالی ہوئی پتلی

افسانہ

نمکین لسی کے ساتھ ایک آدھ سادہ چپاتی ان کی محبوب خوراک تھیں۔ دوسروں کو کوئی چیز رغبت سے کھاتے دیکھ کر خوش ہوتی تھیں اور ہمیشہ دعا کرتی تھیں۔ سب کا بھلا خاص اپنے یا اپنے بچوں کے لئے انہوں نے براہ راست کبھی کچھ نہ مانگا۔ پہلے دوسروں کے لئے مانگتی تھیں اور اس کے بعد مخلوق خدا کی حاجت روائی کے طفیل اپنے بچوں یا عزیزوں کا بھلا چاہتی تھیں۔ اپنے بیٹوں یا بیٹیوں کو انہوں نے اپنی زبان سے کبھی ''میرے بیٹے'' یا ''میری بیٹی'' کہنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو اللہ کا مال کہا کرتی تھیں۔

کسی سے بھی کوئی کام لینا ماں جی پر بہت گراں گزرتا تھا۔ اپنے سب کام وہ اپنے ہاتھوں خود انجام دیتی تھیں۔ اگر کوئی ملازم زبردستی ان کا کوئی کام کردیتا تو نہیں ایک عجیب قسم کی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا تھا اور وہ احسان مندی سے سارا دن اسے دعائیں دیتی رہتی تھیں۔

سادگی اور درویشی کا یہ رکھ رکھاؤ کچھ تو قدرت نے ماں جی کی سرشت میں پیدا کیا تھا۔ کچھ یقیناً زندگی کے زیر و بم نے سکھایا تھا۔

جڑانوالہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد جب وہ اپنے والدین اور خورد سال بھائیوں کے ساتھ زمین کی تلاش میں لائل پور کی کالونی کی طرف روانہ ہوئیں تو انہیں معلوم نہ تھا کہ انہیں کس مقام پر جانا ہے اور زمین حاصل کرنے کے لئے کیا قدم اٹھانا ہے۔ ماں جی بتایا کرتی تھیں کہ اس زمانے میں ان کے ذہن میں کالونی کا تصور ایک فرشتہ سیرت بزرگ کا تھا جو کہ کہیں سر راہ بیٹھا زمین کے پروانے تقسیم کررہا ہوگا۔ کئی ہفتے یہ چھوٹا سا قافلہ لائل پور کے علاقے میں پاپیادہ بھٹکتا رہا۔ لیکن کسی راہ گزار پر انہیں کالونی کا خضر صورت رہنما نہ مل سکا۔ آخر تنگ آکر انہوں نے چک نمبر ۵۰۶ جوان دنوں نیا نیا آباد ہورہا تھا ڈیرے ڈال دیئے۔ لوگ جوق در جوق وہاں آکر آباد ہورہے تھے۔ نانا جی نے اپنی سادگی میں یہ سمجھا کہ کالونی میں آباد ہونے کا شاید یہی ایک طریقہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے ایک چھوٹا سا احاطہ گھیر کر گھاس پھونس کی جھونپڑی بنائی اور بنجر اراضی کا ایک قطعہ تلاش کرکے کاشت کی تیاری کرنے لگے۔ انہی دنوں محکمہ مال کا عملہ پڑتال کے لئے آیا۔ نانا جی کے پاس الاٹ منٹ کے کاغذات نہ تھے۔ چنانچہ انہیں چک سے نکال دیا گیا اور سرکاری زمین پر ناجائز جھونپڑا بنانے کی پاداش میں ان کے برتن اور بستر قرق کرلئے گئے۔

عملے کے ایک آدمی نے چاندی کی دو بالیاں بھی ماں جی کے کانوں سے اتروالیں۔ ایک بالی اتارنے میں ذرا دیر ہوئی تو اس نے زور سے کھینچ لی۔ جس سے ماں جی کے کان کا زیریں حصہ بری طرح سے پھٹ گیا۔

چک ۵۰۶ سے نکل کر جو راستہ سامنے آیا اس پر چل کھڑے ہوئے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ دن بھر لو چلتی تھی۔ پانی رکھنے کے لئے مٹی کا پیالہ بھی پاس نہ تھا۔ جہاں کہیں کوئی کنواں نظر آیا ماں جی اپنا دوپٹہ بھگولیتیں تاکہ پیاس لگنے سے اپنے چھوٹے بھائیوں کی چساتی جائیں۔ اس طرح وہ چلتے چلتے چک نمبر ۵۰۷ میں پہنچے جہاں ایک جان پہچان کے آباد

کارنے نانا جی کو اپنا مزارع رکھ لیا۔ نانا جی ہل چلاتے تھے۔ نانی مویشی چرانے لے جاتی تھیں۔ ماں جی کھیتوں سے گھاس اور چارہ کاٹ کر زمیندار کی بھینسوں اور گایوں کے لئے لایا کرتی تھیں۔ ان دنوں انہیں مقدور بھی نہ تھا کہ ایک وقت کی روٹی بھی پوری طرح کھاسکیں۔ کسی وقت جنگلی بیروں پر گزارہ ہوتا تھا۔ کبھی خربوزے کے چھلکے ابال کر کھالیتے تھے۔ کبھی کسی کھیت میں کچی انبیاں گری ہوئی مل گئیں تو ان کی چٹنی بنا لیتے تھے۔ اور کنٹھے کا ملا جلا ساگ ہاتھ آ گیا۔ نانی محنت مزدوری میں مصروف تھیں۔ ماں جی نے ساگ چولہے پر چڑھایا۔ جب پک کر تیار ہوگیا اور ساگ کا الن لگا کر گھوٹنے کا وقت آیا تو ماں جی نے ڈوئی ایسے زور سے چلائی کہ ہنڈیا کا پیندا ٹوٹ گیا اور سارا ساگ بہہ کر چولہے میں آ پڑا۔ ماں جی کو نانی سے ڈانٹ پڑی اور مار بھی۔ رات کو سارے خاندان نے چولہے کی لکڑیوں پر گرا ہوا ساگ انگلیوں سے چاٹ چاٹ کر کسی قدر پیٹ بھرا۔

چک نمبر ۵۰۷ نانا جی کو خوب راس آیا۔ چند ماہ کی محنت مزدوری کے بعد نئی آبادکاری کے سلسلے میں آسان قسطوں پر ان کو ایک مربع زمین مل گئی۔ رفتہ رفتہ دن پھرنے لگے اور تین سال میں ان کا شمار گاؤں کے کھاتے پیتے لوگوں میں ہونے لگا۔ جوں جوں فارغ البالی بڑھتی گئی توں توں آبائی وطن کی یاد ستانے لگی۔ چنانچہ خوشحالی کے چار پانچ سال گزارنے کے بعد سارا خاندان ریل میں بیٹھ کر منیلہ کی طرف روانہ ہوا۔ ریل کا سفر ماں جی کو بہت پسند آیا۔ وہ سارا وقت کھڑکی سے باہر منہ نکال کر تماشہ دیکھتی رہتیں۔ اس عمل میں کوئلے کے بہت سے ذرے ان کی آنکھوں میں پڑ گئے۔ جس کی وجہ سے کئی روز تک وہ آشوب چشم میں مبتلا رہیں۔ اس تجربے کے بعد انہوں نے ساری عمر اپنے کسی بچے کو ریل کی کھڑکی سے باہر منہ نکالنے کی اجازت نہ دی۔

ماں جی ریل کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بہت خوش رہتیں۔ ہم سفر عورتوں اور بچوں سے فوراً گھل مل جاتیں۔ سفر کی تھکان اور راستے کے گرد وغبار کا ان پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اس کے برعکس اونچے درجوں میں بہت بیزار ہو جاتیں۔ ایک دو بار جب انہیں مجبوراً ائیر کنڈیشن ڈبے میں سفر کرنا پڑا تو وہ تھک کر چور ہوگئیں اور سارا وقت قید کی صعوبت کی طرح ان پر گراں گزرا۔

منیلہ پہنچ کر نانا جی نے اپنا آبائی مکان درست کیا۔ عزیز واقارب کو تحاف دیئے۔ دعوتیں ہوئیں اور پھر ماں جی کے لئے بر ڈھونڈنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اس زمانے میں لائل پور کے مربعہ داروں کی بڑی دھوم تھی۔ ان کا شمار خوش قسمت اور باعزت لوگوں میں ہوتا تھا۔ چنانچہ چاروں طرف سے ماں جی کے لئے پے در پے پیام آنے لگے۔ یوں بھی ان دنوں ماں جی کے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔ برادری والوں پر رعب گانٹھنے کے لئے نانی جی انہیں ہر روز نت نئے کپڑے پہناتی تھیں اور ہر وقت دلہنوں کی طرح سجا کر رکھتی تھیں۔

کبھی کبھار پرانی یادوں کو تازہ کرنے لئے ماں جی

بڑے معصوم فخر سے کہا کرتی تھیں۔ ان دنوں میرا تو گاؤں میں نکلنا دوبھر ہوگیا تھا۔ میں جس طرف سے گزر جاتی لوگ ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے اور کہا کرتے۔ یہ خیال بخش مربعہ دار کی بیٹی جارہی ہے۔ دیکھئے کون خوش نصیب اسے بیاہ کرلے جائے گا۔

''ماں جی! آپ کی اپنی نظر میں کوئی ایسا خوش نصیب نہیں تھا!'' ہم لوگ چھیڑنے کی خاطر ان سے پوچھا کرتے۔

''توبہ توبہ پت'' ماں جی کانوں پر ہاتھ لگاتیں ''میری نظر میں بھلا کوئی کیسے ہوسکتا تھا۔ ہاں میرے دل میں اتنی سی خواہش ضرور تھی کہ اگر مجھے ایسا آدمی ملے جو دوحرف پڑھا لکھا ہو تو خدا کی بڑی مہربانی ہوگی''۔

ساری عمر میں غالباً یہی ایک خواہش تھی جو ماں جی کے دل میں خود اپنی ذات کے لئے پیدا ہوئی۔ اس کو خدا نے یوں پورا کردیا کہ اسی سال ماں جی کی شادی عبد اللہ صاحب سے ہوگئی۔

ان دنوں سارے علاقے میں عبداللہ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ وہ ایک امیر کبیر گھرانے کے چشم و چراغ تھے لیکن پانچ چھ برس کی عمر میں یتیم بھی ہوگئے اور بے حد مفلوک الحال بھی۔ جب باپ کا سایہ سر سے اٹھا تو یہ انکشاف ہوا کہ ساری آبائی جائیداد رہن پڑی ہے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب اپنی والدہ کے ساتھ ایک جھونپڑے میں اٹھ آئے۔ زر اور زمین کا یہ انجام دیکھ کر انہوں نے ایسی جائیداد بنانے کا عزم کرلیا جو مہاجنوں کے ہاتھ گروی نہ رکھی جا سکے۔ چنانچہ عبداللہ صاحب دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ وظیفے پر وظیفہ حاصل کرکے اور دو سال کے امتحان ایک ایک سال میں پاس کرکے پنجاب یونیورسٹی کے میٹریکولیشن میں اول آئے۔ اس زمانے میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی مسلمان طالب علم نے یونیورسٹی امتحان میں ریکارڈ قائم کیا ہو۔

اڑتے اڑتے یہ خبر سرسید کے کانوں میں پڑگئی جو اس وقت علی گڑھ مسلم کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے۔ انہوں نے اپنا خاص منشی گاؤں میں بھیجا اور عبد اللہ صاحب کو وظیفہ دے کر علی گڑھ بلا لیا۔ یہاں پر عبداللہ خوب بڑھ چڑھ کر اپنا رنگ نکالا اور بی اے کرنے کے بعد انیس برس کی عمر میں وہیں پر انگریزی، عربی، فلسفہ اور حساب کے لیکچر ہوگئے۔

سرسید کو اس بات کی دھن تھی کہ مسلمان نوجوان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اعلیٰ ملازمتوں پر جائیں۔ چنانچہ انہوں نے عبد اللہ صاحب کو سرکاری وظیفہ دلوایا تاکہ وہ انگلستان میں جاکر آئی سی ایس کے امتحان میں شریک ہوں۔

پچھلی صدی کے بڑے بوڑھے سات سمندر پار کے سفر کو بلائے ناگہانی سمجھتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی والدہ نے بیٹے کو ولایت جانے سے منع کردیا۔ عبداللہ صاحب کی سعادت مندی آڑے آئی اور انہوں نے

افسانہ

وظیفہ واپس کر دیا۔

اس حرکت پر سرسید کے بے حد غصہ بھی آیا اور دکھ بھی ہوا۔ انہوں نے لاکھ سمجھایا، بجھایا، ڈرایا دھمکایا لیکن عبداللہ صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

''کیا تم اپنی بوڑھی ماں کو قوم کے مفاد پر ترجیح دیتے ہو؟'' سرسید نے کڑک کر پوچھا۔

''جی ہاں'' عبداللہ صاحب نے جواب دیا۔

یہ ٹکا سا جواب سن کر سرسید آپے سے باہر ہوگئے۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے پہلے انہوں نے عبد اللہ صاحب کو لاتوں، مکوں، تھپڑوں اور جوتوں سے خوب پیٹا اور کالج کی نوکری سے برخواست کر کے یہ کہہ کر علی گڑھ سے نکال دیا ''اب تم ایسی جگہ جا کر مرو جہاں سے میں تمہارا نام بھی نہ سن سکوں''۔

عبداللہ صاحب جتنے سعادت مند بیٹے تھے۔ اتنے ہی سعادت مند شاگرد بھی تھے۔ نقشے پر انہیں سب سے دور افتادہ اور دشوار گزار مقام گلگت نظر آیا۔ چنانچہ ناک کی سیدھ میں گلگت پہنچے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کی گورنری کے عہدے پر فائز ہوگئے۔

جن دنوں ماں جی کی منگنی کی فکر ہو رہی تھی انہی دنوں عبد اللہ صاحب بھی چھٹی پر گاؤں آئے ہوئے تھے۔ قسمت میں دونوں کا سنجوگ لکھا ہوا تھا۔ ان کی منگنی ہوگئی اور ایک ماہ بعد شادی بھی ٹھہر گئی تا کہ عبد اللہ صاحب دلہن کو اپنے ساتھ گلگت لے جائیں۔

منگنی کے بعد ایک روز ماں جی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پاس والے گاؤں میں میلہ دیکھنے گئی ہوئی تھیں۔ اتفاقاً یا شاید دانستہ عبداللہ صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ ماں جی کی سہیلیوں نے انہیں گھیر لیا اور ہر ایک نے چھیڑ چھیڑ کر ان سے پانچ پانچ روپے وصول کر لئے۔ عبد اللہ صاحب نے ماں جی کو بھی بہت سے روپے پیش کیے لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ بہت اصرار بڑھ گیا تو مجبوراً ماں جی نے گیارہ پیسے کی فرمائش کی۔

''اتنے بڑے میلے میں گیارہ پیسے لے کر کیا کرو گی'' عبداللہ صاحب نے پوچھا۔

اگلی جمعرات کو آپ کے نام سے مسجد میں تیل ڈال دوں گی۔ ماں جی نے جواب دیا۔

زندگی کے میلے میں بھی عبد اللہ صاحب کے ساتھ ماں جی کا لین دین صرف جمعرات کے گیارہ پیسوں تک ہی محدود رہا۔ اس سے زیادہ رقم نہ کبھی انہوں نے مانگی نہ اپنے پاس رکھی۔

گلگت میں عبد اللہ صاحب کی بڑی شان و شوکت تھی۔ خوبصورت بنگلہ، وسیع باغ، نوکر چاکر دروازے پر سپاہیوں کا پہرہ۔ جب عبد اللہ صاحب دورے پر باہر جاتے تھے یا واپس آتے تھے تو سات توپوں کی سلامی دی جاتی تھی۔ یوں بھی گلگت کا گورنر خاص سیاسی انتظامی اور سماجی اقتدار کا حامل تھا لیکن ماں جی پر اس سارے جاہ و جلال کا ذرہ بھی اثر نہ ہوا۔ کسی قسم

افسانہ

کا چھوٹا بڑا ماحول ان پر اثر انداز نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ماں جی کی اپنی سادگی اور خود اعتمادی ہر ماحول پر خاموشی سے چھا جاتی تھی۔

ان دنوں سر مالکم ہیلی حکومت برطانیہ کی طرف سے گلگت کی روسی اور چینی سرحدو پر پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر مامور تھے۔ ایک روز لیڈی ہیلی اور ان کی بیٹی ماں جی سے ملنے آئیں۔ انہوں نے فراک پہنے ہوئے تھے اور پنڈلیاں کھلی تھیں۔ یہ بے حجابی ماں جی کو پسند نہ آئی۔ انہوں نے لیڈی ہیلی سے کہا ''تمہاری عمر تو جیسے گزرنی تھی گزر رہی گئی ہے۔ اب آپ اپنی بیٹی کی عاقبت تو خراب نہ کرو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے مس ہیلی کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا اور چند مہینوں میں اسے کھانا پکانا، سینا پرونا، برتن مانجھنا، کپڑے دھونا سکھا کر ماں باپ کے پاس بھیج واپس بھیج دیا۔

جب روس میں انقلاب برپا ہوا تو لارڈ کچر سرحدوں کا معائنہ کرنے گلگت آئے۔ ان کے اعزاز میں گورنر کی طرف سے ضیافت کا اہتمام ہوا۔ ماں جی نے اپنے ہاتھ سے دس بارہ قسم کے کھانے پکائے۔ کھانے لذیذ تھے۔ لارڈ کچر نے اپنی تقریر میں کہا ''مسٹر گورنر، جس خانساماں نے یہ کھانے پکائے ہیں، براہ مہربانی میری طرف سے آپ ان کے ہاتھ چوم لیں''۔

دعوت کے بعد عبداللہ صاحب فرحاں وشاداں گھر لوٹے تو دیکھا کہ ماں جی باورچی خانے کے ایک کونے میں چٹائی پر بیٹھی نمک اور مرچ کی چٹنی کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا رہی ہیں۔

ایک اچھے گورنر کی طرح عبداللہ صاحب نے ماں جی کے ہاتھ چومے اور کہا ''اگر لارڈ کچر یہ فرمائش کرتا کہ وہ خود خانساماں کے ہاتھ چومنا چاہتا ہے تو پھر تم کیا کرتیں؟''

''میں'' ماں جی تنک کر بولیں۔ ''میں اس کی مونچھیں پکڑ کر جڑ سے اکھاڑ دیتی۔ پھر آپ کیا کرتے؟''

''میں'' عبداللہ صاحب نے ڈرامہ کیا۔ ''میں ان مونچھوں کو روئی میں لپیٹ کر وائسرائے کے پاس بھیج دیتا اور تمہیں ساتھ لے کر کہیں اور بھاگ جاتا، جیسے سرسید کے ہاں سے بھاگا تھا''۔

ماں جی پر ان مکالموں کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ لیکن ایک بار . . . . .
ماں جی رشک وحسد کی اس آگ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں جو ہر عورت کا ازلی ورثہ ہے۔

گلگت میں ہر قسم کے احکامات ''گورنری'' کے نام پر جاری ہوتے تھے۔ جب یہ چرچا ماں جی تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب سے گلہ کیا۔

''بھلا حکومت تو آپ کرتے ہیں لیکن گورنری گورنری کہہ کر مجھ غریب کا نام بیچ میں کیوں لایا جاتا ہے خواہ مخواہ!''

عبداللہ صاحب ''علی گڑھ کے پڑھے ہوئے

افسانہ

تھے۔ رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور بے اعتنائی سے فرمایا۔ بھاگوان یہ تمہارا نام تھوڑا ہے۔ گورنر تو دراصل تمہاری سوکن ہے جو دن رات میرا پیچھا کرتی رہتی ہے''۔

مذاق کی چوٹ تھی۔ عبداللہ صاحب نے سمجھا بات آئی گئی ہوگئی لیکن ماں جی کے دل میں غم بیٹھ گیا۔ اس غم میں وہ اندر ہی اندر کڑھنے لگیں۔

کچھ عرصہ کے بعد کشمیر کا مہاراجہ پرتاب سنگھ اپنی مہارانی کے ساتھ گلگت کے دورے پر گیا۔ ماں جی نے مہارانی سے اپنے دل کا حال سنایا۔ مہارانی بھی سادہ عورت تھی۔ جلال میں آگئی ''ہائے ہائے ہمارے راج میں ایسا ظلم۔ میں آج ہی مہاراج سے کہوں گی کہ وہ عبداللہ صاحب کی خبر لیں''۔

جب یہ مقدمہ مہاراجہ پرتاب سنگھ تک پہنچا تو انہوں نے عبداللہ صاحب کو بلاکر پوچھ گچھ کی۔ عبداللہ اصاحب بھی حیران تھے کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا افتاد آپڑی۔ لیکن جب معاملے کی تہہ تک پہنچے تو دونوں خوب ہنسے۔ آدمی دونوں ہی وضعدار تھے۔ چنانچہ مہاراجہ نے حکم نکالا کہ آئندہ سے گلگت کی گورنری کو وزارت اور گورنر کو وزیر وزارت کے نام سے پکارا جائے۔ ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی تک گلگت میں یہی سرکاری اصطلاحات رائج تھیں۔

یہ حکم نامہ سن کر مہارانی نے ماں جی کو بلاکر خوشخبری سنائی کہ مہاراج نے گورنری کو دیس نکالا دے دیا ہے۔

''اب تم دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو''۔ مہارانی نے کہا۔ ''کبھی ہمارے لئے بھی دعا کرنا۔''

مہاراجہ اور مہارانی کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے وہ اکثر ماں جی سے دعا کی فرمائش کرتے تھے۔

اولاد کے معاملے میں ماں جی کیا واقعی خوش نصیب تھیں؟ یہ ایک ایسا سوالیہ نشان ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں سوجھتا۔

ماں جی خود ہی تو کہا کرتی تھیں کہ ان جیسی خوش نصیب ماں دنیا میں کم ہی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر صبر و شکر، تسلیم و رضا کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو اس خوش نصیب کے پردے میں کتنے دکھ، کتنے غم، کتنے صدمے نظر آتے ہیں۔

اللہ میاں نے ماں جی کو تین بیٹیاں اور تین بیٹے عطا کئے۔ دو بیٹیاں شادی کے کچھ عرصہ بعد یکے بعد دیگرے فوت ہوگئیں۔ سب سے بڑا عین عالم شباب میں انگلستان جاکر گزر گیا۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اللہ کا مال تھا اللہ نے لے لیا۔ لیکن کیا وہ اکیلے میں چھپ چھپ کر خون کے آنسو رویا نہ کرتی ہوگی!

جب عبداللہ صاحب کا انتقال ہوا تو ان کی عمر باسٹھ سال اور ماں جی کی عمر پچپن سال تھی۔ سہ پہر کا

وقت تھا۔ عبداللہ صاحب بان کی کھردری چارپائی پر حسب معمول گاؤ تکیہ لگا کر نیم دراز تھے۔ ماں جی پائنتی بیٹھی چاقو سے گنا چھیل چھیل کر ان کو دے رہی تھیں۔ وہ مزے مزے سے گنا چوس رہے تھے اور مذاق کر رہے تھے۔ پھر یکا یک سنجیدہ ہو گئے اور کہنے لگے۔ ''بھا گوان شادی سے پہلے میلے میں میں نے تمہیں گیارہ پیسے دیئے تھے کیا ان کو واپس کرنے کا وقت نہیں آیا؟''

ماں جی نے نئی دلہنوں کی طرح سر جھکا لیا اور گنا چھیلنے میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے سینے میں بیک وقت بہت خیال امڈ آئے۔ ''ابھی وقت کہاں آیا ہے۔ سرتاج شادی کے پہلے گیارہ پیسوں کی تو بڑی بات ہے۔ لیکن شادی کے بعد جس طرح تم نے میرے ساتھ نباہ کیا ہے اس پر میں نے تمہارے پاؤں دھو کر پینے ہیں۔ اپنی کھال کی جوتیاں تمہیں پہنانی ہیں۔ ابھی وقت کہاں آیا ہے میرے سرتاج۔

لیکن قضا و قدر کے بہی کھاتے میں وقت آ چکا تھا۔ جب ماں جی نے سر اٹھایا تو عبداللہ صاحب گنے کی قاش منہ میں لئے گاؤ تکیہ پر سو رہے تھے۔ ماں جی نے بہتیرا بلایا، ہلایا، چمکارا لیکن عبداللہ صاحب ایسی نیند سو گئے تھے جس سے بیداری قیامت سے پہلے نہیں۔

ماں جی نے اپنے باقی ماندہ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کو سینے سے لگا لگا کر تلقین کی ''بچہ رونا مت۔ تمہارے ابا جی آرام سے سو رہے تھے، اسی آرام سے چلے گئے۔ اب رونا مت۔ ان کی روح کو تکلیف پہنچے گی''۔

کہنے کو تو ماں جی نے کہہ دیا کہ اپنے ابا کی یاد میں نہ رونا، ورنہ ان کو تکلیف پہنچے گی لیکن کیا وہ خود چوری چھپے اس خاوند کی یاد میں نہ روئی ہوں گی جس نے باسٹھ سال کی عمر تک انہیں ایک الھڑ دلہن سمجھا اور جس نے گورنری کے علاوہ اور کوئی سوکن اس کے سر پر لا کر نہیں بٹھائی۔

جب وہ خود چل دیں تو اپنے بچوں کے لئے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئیں، جو قیامت تک انہیں عقیدت کے بیابان میں سرگرداں رکھے گا۔

اگر ماں جی کے نام پر خیرات کی جائے تو گیارہ پیسے سے زیادہ ہمت نہیں ہوتی، لیکن مسجد کا ملا پریشان ہے کہ بجلی کا ریٹ بڑھ گیا ہے اور تیل کی قیمت گراں ہو گئی ہے۔ ماں جی کے نام پر فاتحہ دی جائے تو مکئی کی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی سامنے آتی ہے لیکن کھانے والا درویش کہتا ہے کہ فاتحہ درود میں پلاؤ اور زردے کا اہتمام لازم ہے۔

ماں جی کا نام آتا ہے تو بے اختیار رونے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن اگر رویا جائے تو ڈر لگتا ہے کہ ان کی روح کو تکلیف نہ پہنچے اور اگر ضبط کیا جائے تو خدا کی قسم ضبط نہیں ہوتا۔

☆☆☆

غزلیں

رشیدؔ شہیدی

وہ آئیں شہر میں خوشبو کا قافلہ ٹھہرے
اس انتظار میں کچھ دیر تو صبا ٹھہرے

یہ زندگی کا شب و روز مشغلہ ٹھہرے
نگاہ تجھ سے ملی ہے تو سلسلہ ٹھہرے

تمہارا عکس امانت سمجھ کے رکھ لوں گا
جو چند لمحے میرے دل کا آئینہ ٹھہرے

ہمیں تو یاد نہیں تیری یاد کے جھونکے
کب آئے کب گئے کس وقت کس جگہ ٹھہرے

لکیریں ہاتھوں کی ساکت رہیں تو بات بھی ہے
ہمارے جینے کا کوئی تو آسرا ٹھہرے

گواہی دینے کو ان نیم خواب آنکھوں میں
ہماری آنکھوں کا کوئی تو رت جگا ٹھہرے

ہمیں ہو واسطہ کیا دہر کی خوشی سے رشیدؔ
کہ ہم ازل سے تیرے غم سے آشنا ٹھہرے

oOo

رائل انکلیو A4
دارالشفاء روڈ، حیدرآباد۔24
فون:040-24510836

راشد احمد راشدؔ

مری شاعری کا مقصد نہ بیانِ دوستاں ہے
نہ گلوں کا کچھ فسانہ، نہ شکایتِ زماں ہے

نہ وہ پاسِ آدمیت، نہ وہ قدرِ بزرگاں ہے
نہ وہ اگلی صحبتیں ہیں، نہ وہ شانِ دوستاں ہے

مین زباں سے اپنی ہرگز نہ بیاں کروں گا کچھ بھی
مری خامشی مسلسل مرے دل کی ترجماں ہے

ہوں شناسِ قدر دل میں، یہ میری اطاعتیں ہیں
یہی میرا دین و ایماں، یہی میرا آستاں ہے

مجھے ڈر نہیں ہے راشدؔ کہ ہوں لاکھ دشمنِ جاں
مری موت، زندگی کی جو خود ایک پاسباں ہے

oOo

حیدرآباد
رابطہ:9951519825

غزلیں

رحیم قمر

کشتیاں اپنی کناروں پہ جلانے والے
عزم کی لو کو دلوں میں تھے بڑھانے والے

نیست و نابود ہوے شر وہ مچانے والے
حق پرستوں کو جو تھے لوگ ستانے والے

حیثیت ہم ہی یہاں اپنی گرانے والے
ہم بھی مجرم ہیں یہاں حق کو چھپانے والے

ساتھ ظلمت کا یہاں تم ہو نبھانے والے
وہ تو سورج کو تھے آئینہ دکھانے والے

خوف کے سائے میں جیتے ہیں ہمارا دل ہے
پھر بھی مرعوب نہیں سن اے زمانے والے

خرمنِ ہستی کو اک آہ جلا دیتی ہے
اتنا بھی خوش نہ ہو اے ٹھور ٹھکانے والے

عقل تسلیم نہیں کرتی جو باتوں کو قمر
لوگ کچھ ایسے ہیں بے پر کی اڑانے والے

oOo

9-20-598، مجاہد نگر
مالاپلی، نظام آباد 503001

سید تمجید حیدر

شہر کی چیخ سے انجان نہیں ہے کوئی
پر اس آواز کی پہچان نہیں ہے کوئی

ہم زمیں زادوں کی تقدیر میں ہے جہد و جہاد
آسمانوں میں پریشان نہیں ہے کوئی

اُونگھ آتی ہے تو پھر لوگ سُلا دیتے ہیں
جاگتے رہنا بھی آسان نہیں ہے کوئی

بھاگنے والوں کے لوٹ آنے کی امید نہ کر
بے وفا لوگوں کا ایمان نہیں ہے کوئی

میری آزادہ مزاجی کو نہ پابند کرو
یہ مرا مُلک ہے، زندان نہیں ہے کوئی

کل ہر اک بات پہ بڑھتا تھا تجسّس سب کا
اب کسی بات پہ حیران نہیں ہے کوئی

سب کے سب اپنے تکبر کو لئے گھومتے ہیں
اور یہ بھی کہ پشیمان نہیں ہے کوئی

غمِ تنہائی کا یہ بوجھ اٹھائے کیسے
تن میں تمجیؔد کے اب جان نہیں ہے کوئی

oOo

فلیٹ نمبر 302، تیسری منزل
فاطمہ ریسیڈنسی، زہرہ نگر، روڈ نمبر 10
بنجارہ ہلز، حیدرآباد 034 500

تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

حکومت تلنگانہ، محکمہ اقلیتی بہبود

AN ISO 9001 : 2015 Certified Organisation

اُردو سیکھنے کے خواہشمند اصحاب کے لئے خوشخبری

مختصر مدتی اُردو بنیادی کورس

اُردو اپنی لسانی خوبیوں کی وجہ سے عالمی سطح پر مقبول ہے اور یہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب و ثقافت کی نمائندہ بھی ہے۔ شائستگی کی علمبردار اس زبان کی بقا کے لئے ناگزیر ہے کہ اس کے فروغ عام کے سنجیدہ اقدامات کئے جائیں۔ اسی منشاء سے تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی غیر اُردو داں اصحاب کے لئے اُردو دانی کے مختلف کورس کا آغاز کر چکی ہے ان ہی میں ایک مختصر مدتی اُردو بنیادی آن لائین کورس شامل ہے۔ یہ اہل اُردو کی ذمہ داری ہے کہ فروغ اُردو کے ان اقدامات کے لئے اپنا دست تعاون دراز کریں۔ اپنے نونہالوں کو اُردو سیکھنے کی طرف مائل کریں اور اس جانب غیر اُردو داں اصحاب کو راغب کریں۔

داخلوں کے لئے کورس کے رجسٹریشن کی ویب سائٹ : https://ecourse.urduacademyts.com

کورس کی خصوصیات

- اس کورس کو ماہرین تعلیم کی جانب سے ڈیزائن کیا گیا ہے جس کے ذریعہ ایک ہفتہ کے اندر اُردو زبان سیکھی جاسکتی ہے۔
- عالمی رسائی کے تناظر میں آن لائن تدریس کے مصدقہ پلیٹ فارم پر موجودہ ویب معیار کے مطابق کورس تیار کیا گیا ہے۔
- کورس تک آسان رسائی ڈیسک ٹاپ کمپیوٹر اور لیاپ ٹاپ کے علاوہ اسمارٹ فون اور ٹیابلیٹ کے ذریعہ بھی مہیا کی گئی ہے۔
- کورس فیس کی آن لائن ادائیگی کے لئے Paypal، Stripe اور Razor Pay جیسے معتبر و محفوظ طریقے دستیاب ہیں۔
- کورس کے اسباق ساکن اور متحرک تحریر اور آڈیو، ویڈیو اور سہل ترین کوئز پر مشتمل ہیں۔ متعلقہ مواد پی۔ڈی۔ایف فائل شکل میں دستیاب رہے گا۔
- کورس کا دورانیہ متعینہ وقت کے لئے ہے اور صرف چار آسان حصوں پر مشتمل ہے:

1) حروف تہجی اور اعداد
2) نصف اشکال، اعراب اور ان کی حرکات
3) حروف اور آوازوں کی شناخت
4) دوحرفی اور سہ حرفی الفاظ کی شناخت

- ویڈیو اسباق میں روایتی اور کیلی گرافی (خطاطی) طریقہ تدریس شامل ہے۔
- کامیاب امیدواروں کو حاصل کئے گئے نشانات کی بنیاد پر تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی کی جانب سے اسناد فراہم کی جائیں گی۔
- کورس کی فیس مبلغ -/315 (تین سو پندرہ روپے) رکھی گئی ہے۔

مزید معلومات کے لئے فون نمبر 040-23237810، 8886012303 اور 9700117738 پر ربط کیا جاسکتا ہے۔
دفتر تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی، حج ہاؤز، چوتھی منزل، نامپلی، حیدرآباد-500001، تلنگانہ

منجانب
ڈاکٹر محمد غوث
ڈائرکٹر رسکریٹری، تلنگانہ ریاستی اُردو اکیڈیمی

Urdu Monthly
Qaumi Zaban

AN OFFICIAL ORGAN OF TELANGANA STATE URDU ACADEMY | Vol.6 No.12 | December 2021

RNI Regn. No. : TELURD/2015/32622
Date of Publication : 15th of every month

RNP No. H-HD-GPO/059/2020-2022
Posting Date : 18th, 19th and 20th of every month

Accredited under the
University Grants Commission (UGC) Care-List

ڈاکٹر محمد غوث ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ ریاستی اردو اکیڈیمی علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش (عالمی یومِ اردو اور قومی یومِ تعلیم) کے ضمن میں ہائی اسکول، جونیر و ڈگری کالج، یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات و ریسرچ اسکالرس کے لئے منعقدہ تحریری مقابلوں کے کامیاب طلباء و طالبات میں تقسیم انعامات کی تقریب سے صدارتی خطاب کرتے ہوئے۔
تصویر میں ڈاکٹر وی سنیتا پدماوتی پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج برائے اناث، مسٹر وی کرشنا سپرنٹنڈنٹ اردو اکیڈیمی، کنوینرس ڈاکٹر ناظم علی، ڈاکٹر اسلم فاروقی، ڈاکٹر جہانگیر احساس، و دیگر دیکھے جاسکتے ہیں۔

Regd. Office : Telangana State Urdu Academy,
4th Floor, Haj House, Nampally, Hyderabad - 500 001 T.S. (India)
Phone : 91-04-23237810, Fax : 040-66362931 Email: qaumizaban.tsua2015@gmail.com
ISO 9001 : 2015 Certified Organisation   Website: www.urduacademyts.com

اردو اسکالرس کی دنیا

International Refereed Journal for Urdu Literature

EISSN: 2320-8910, ISSN: 2320-5369

Volume VII, Issue III August 2019

URDU SCHOLARS KI DUNIYA-IRJU

IMPACT FACTOR: 0.383

INDEXING:

Cosmos Impact Factor-Berlin Brandenburg, Kleinmachnow- Germany
Ulrich's Web- Global Series Directory, USA
Directory of Research Journals Indexing, India
Open J- Gate, India
Pub. Ilas. (International Research Library)
Yumpu-Gewerbestrasse-Diepoldsau- Switzerland

MAAZ PUBLICATIONS • Malegaon• MAHARASHTRA• INDIA

Urdu Sahitya Academy Award 2016
(Maharashtra State)

JOURNAL INDEXED IN

GIF Global Impact Factor, Scientific Indexing Services, Cosmos Impact Factor, calameo, Yumpu, OCLC WorldCat, slideshare, BASE, ResearchGate, DocSlide

فہرست

1	ترکی اور اردو زبان میں استعمال ہونے والے روز مرہ الفاظ کی بناوٹ، وضع اور مفہوم کے تناظر میں تقابلی جائزہ ایمل سیلیم، لیکچرر، انقرہ یونی ورسٹی، انقرہ۔ترکی	01-12
2	روہی ادب (تاریخ ادبیات پشتو) اور اس کا اردو ترجمہ: ایک جائزہ ڈاکٹر نقیب احمد جان، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، ویمن یونیورسٹی صوابی، خیبر، پختونخوا۔پاکستان ڈاکٹر منزہ مبین، صدر شعبہ اردو، ویمن یونیورسٹی صوابی، خیبر، پختونخوا۔پاکستان	13-24
3	نظریے کا جدید تصور اور "تنقیدی مباحثاتی تجزیہ" کا ذرائع ابلاغ پر اطلاق (اردو اخباروں کی خبروں کے ذیل میں) منور علی کلوڑ، پی ایچ ڈی اسکالر، شعبہ صحافت، اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور۔پاکستان ڈاکٹر سجاد احمد پراچہ، چیئرمین شعبہ صحافت، اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور۔پاکستان	25-31
4	سر سید احمد خان کی ادبی، علمی اور قومی خدمات ڈاکٹر عقیلہ سید غوث، پرنسپل، آرٹس اینڈ کامرس مہیلا کالج، امباجوگی، ضلع بیڑ، مہاراشٹر۔انڈیا	32-37
5	ناول دشتِ سوس میں فلسفہ وحدت الوجود محمد فرید، لیکچرار، شعبہ اردو، اوپی ایف بوائز کالج ایچ ایٹ فور، اسلام آباد۔پاکستان	38-42
6	شروح ہائے غالبؔ کا نفسیاتی تناظر خالد محمود، ایس ایس ای اردو اسکول ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، لیہ، پنجاب۔پاکستان	43-51
7	شعر الہند۔مولانا عبد السلام ندوی کی تنقیدی بصیرت کا شاہکار ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، آندھرا پردیش۔انڈیا	52-56
8	اردو لغت نویسی میں مستشرقین کا رول ڈاکٹر شیخ فاروق باشا، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، آندھرا پردیش۔انڈیا	57-61

اردو لغت نویسی میں مستشرقین کا رول

ڈاکٹر شیخ فاروق باشا
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، رائے چوٹی، ضلع کڈپہ، آندھراپردیش۔انڈیا

ہندوستان میں مسلم فاتحین کی آمد کے بعد جس طرح ترسیل خیالات کا مسئلہ پیدا ہوا اسی طرح سولہویں صدی میں یوروپی اقوام جیسے برطانیوں ،فرانسیسوں اور پرتگالیوں کی ہندوستان میں آمد کے بعد بھی یہی مسئلہ درپیش ہوا۔ چنانچہ لغت نگاری کی شدت سے کمی محسوس ہوئی۔ چنانچہ مستشرقین نے لغت نویسی کے بنیادی کام کیے ان لغات سے جہاں اردو سیکھنے والے انگریزوں کو فائدہ ہوا وہیں اردو اور انگریزی اور دیگر زبانوں کے جاننے والوں کو بھی بیش بہا فائدہ ہوا۔

مستشرقین کو اردو لغت نویسی کے سلسلہ میں مواد کی عدم دستیابی ،وسائل کی کمی اور مختلف مشرقی زبانوں کے ماخذ و مصادر کے صحیح نتائج تک رسائی جیسے مشکل امور کا سامنا کرنا پڑا ،اس کے باوجود انہوں نے بڑی محنت ،عرق ریزی اور تحقیقی کاوشوں سے بہت حد تک کامیابی حاصل کی۔ اور اس سلسلہ میں دیانت و امانت سے کام لیا اور اردو لغت نویسی کے لیے مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ مستشرقین کی اردو لغت نگاری کی خدمات تاریخی اعتبار سے اس طرح ہیں۔

1630ء میں پہلی چہار لسانی لغت (فارسی ،ہندوستانی ،انگریزی ،پرتگالی) سورت کے انگریزی کارخانے میں لکھی گئی جس کو مستشرقین کی پہلی فرہنگ کہا جاسکتا ہے ۔اس لغت کا تذکرہ گریرسن (Greeson) نے مسٹر کورج (Coridge) کی اورینٹل کیٹلاگ (Oriental Catalogue) کے حوالے سے کیا ہے جو فی الوقت عدم دستیاب ہے ۔سہ لسانی لغت میں جیرونیمو خاویر Jeronimo xavier کی تصنیف Hindustani Persisch Portugiesisch جو 1599ء سے قبل کی تصنیف یا تالیف ہے یا اسے Vocabularium Portugalico Hindustano Persicum بھی کہتے ہیں ۔اس کا ایک قلمی نسخہ لندن کے King,s college کے کتب خانہ میں محفوظ ہے ۔اس لغت کو اردو کی قدیم ترین سہ لسانی لغت قرار دی جاسکتی ہے گریرسن Greerson نے ایک اور قدیم لغت کا تذکرہ کیا ہے جو 1704ء کے لگ بھگ لکھی گئی ۔مولوی عبدالحق نے پروشیا کا باشندہ جان جوشوا کٹلر (Joshuas Axteler) کی تالیف کی نشاندہی کی ہے جو 1715ء کی تالیف ہے۔ اس تالیف کو ڈیوڈل نے 1743ء میں شائع کیا۔ اس میں ہندوستانی الفاظ و محاورات رومن حروف میں اور املا ڈچ طریقے پر ہے اسی طرح سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں مستشرقین نے اپنی نجی ضرورتوں ،مذہبی یا تبلیغی مقاصد کے پیش نظر لکھیں ۔ Antanio de Saldanha کی دعاؤں کی کتاب جس میں ہندوستانی لغات بھی شامل ہے ۔اگناشیو اکارمونے Agnacio Arcamone کی قواعد کی کتاب جس میں لاطینی ،کانکنی لغت اور دکنی زبان کی خصوصیتوں پر مضمون شامل ہے ۔ایک اور مستشرق جان دیپڈوزا (S.J.depodaza) 1640 تا 1672 کی تالیف Inistrue -Sampava Comfissa & sacramontal Enlingue Indostantion

بھی سترھویں صدی کے وسط کی ایک ہندوستانی لغت کا قابل ذکر نمونہ ہے۔

جان ہیڈلے نے 1772ء میں صرف ونحو مع فرہنگ انگریزی واردو شائع کی جس میں اردو الفاظ فارسی رسم خط میں لکھے گئے ہیں، جاج فرگوسن کی انگریزی اردو۔اردو۔انگریزی لغت A short Dictionary of the Hindustani Language 1773ء میں شائع ہوئی۔ہنری ہیریسکی انگریزی۔ہندوستانی لغت 1790ء میں شائع ہوئی۔

اٹھارہویں صدی عیسوی میں انگلستان اور فرانس میں سیاسی تسلط کے لیے رسہ کشی شروع ہوئی جس کے نتیجے میں انگلستان نے ہندوستان کے شمال مشرق یعنی کلکتہ کو اپنا مرکز بنایا تو فرانسیسیوں نے دکن کو ترجیح دی۔فرانسیسیوں نے سیاح اور مبلغین کی مدد سے کثیر لسانی لغت کی طرف توجہ دی جن کی ضرورت مذہبی کم، سیاسی زیادہ تھی 1785ء میں فرانسیسی علماء کی مدد سے کا پوچن مشنری میں ایک چہار لسانی لغت (لاطینی، ہندی، فرانسیسی، اردو) تیار کی جس کو بنیاد بنا کر Garscin de Tassi گارسین دتاسی کے شاگرد دولونگل نے 1876ء میں ندوستان فرانسیسی، فرانسیسی ہندوستانی لغت کی پہلی قسط شائع کی اسی طرح فرانسیسی مشنریوں نے کئی ایک فرہنگیں تالیف کیں جن میں گیوساماریا (Givsappe Maria de Berninide Gargano) کی ہندی، لاطینی، اطالوی لغت، فادر کاسیانو Fr.Cassian de macerate کی اطالوی لغت اور ترائی گوئی روس (Euganio Trigueiros) 1687ء تا 1741ء کی کتاب اجزائے ہندوستانی لغت Freagmatode vocalulario de lingua Indostana سیلافس کی ہندوستانی حروف تہجی کی کتاب جس میں قواعد اور لغات کے علاوہ عیسائی عقاید درج ہیں اسی کی ایک اور تصنیف اطالوی، ہندوستانی، ہندوستانی، اطالوی لغت Vocabulario Italiano Indostano and Indostano Italicno قابل ذکر ہے۔

ادھر شمال مشرق میں برطانوی سامراج نے ملک گیری کی ہوس میں ہندوستانی عوام کی زبان کی طرف توجہ دی۔لیکن فرہنگ نویسی میں ان کی خدمات کو اس وقت جب کہ فرہنگ نویسی کے ابتدائی کام ہو رہے تھے کسی بھی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

برطانوی مستشرقین میں جان بارتھوک گل کرسٹ (John Borthwick Gilchrist) کی خدمات بہت زیادہ ہیں۔جن کا زمانہ (1759ء تا 1842ء) تھا ان کو مستشرقین میں اس طرح امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے لغت اور قواعد دونوں میں اپنے محدود وسائل کے باوجود انتھک محنت سے بے مثال کارنامے انجام دیئے۔ان کی انگلش ہندوستانی لغت "English Hindoostanee Dictionary" پہلی بار 1786ء میں کلکتہ سے اس کا پہلا حصہ شائع ہوا۔گلکرسٹ نے لغت کے پہلے ایڈیشن میں رومن املا بروئے کار لایا تھا۔گلکرسٹ نے اس لغت کی ترتیب و تالیف میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لایا۔اس کی محنت اور تحقیق کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے انگریزی الفاظ کے کثیر مترادفات لکھے ہیں۔مثلاً لفظ Honour کی وضاحت بتیس الفاظ سے کی ہے۔آبرو، عزت، حرمت، نام، وقر، پت، اعزاز، افتخار، اعتبار، وقار، بزرگی، عظمت، بڑائی، شان، اوج، شکوہ، مرتبہ، منزلت، پایہ، منصب، درجہ، سرفرازی، حمیت، غیرت، ننگ آن بان، ادب، تکریم، احترام، تعظیم، آدر، مان، آرائش، زیب، حقوق، ننگ و ناموس۔کہیں کہیں کثرت مترادفات کے چکر میں ان سے غلطی بھی ہوئی ہے۔

Prejudice کے ۱۹ مترادفات اس طرح لکھتے ہیں:

اعتقاد، تعصب، بدگمانی، بدزنی، مضرت، ضرر، نقصان، طرفداری، رغبت، حسن ظن، عقیدہ، عقدہ، گرہ، کھرچی، گانٹھ، گھاٹا، دغدغہ، خلش، اینٹھ۔(بحوالہ گلکرسٹ اینڈ دی لینگویز آف ہندوستان، صدیق الرحمٰن قدوائی۔ص ۹۹)

بعض الفاظ کے معانی میں بھی لغزشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جیسے Self conceited کا معنی من موجی Self praise کا معنی خود فروشی Presumption کا لن ترانی۔ انکل پچو Tohumble چنگا۔ بانا۔ Flexible کا معنی چھڑا۔ لکھا گیا ہے۔

لفظ Poem کے معانی، قطعہ بند، ریختہ، مثنوی، قصیدہ، غزل، واسوز، ترجیع بند کے ساتھ سوز و گداز کو بھی شامل کیا ہے۔ اس طرح معانی میں اصناف نظم اور خصوصیات نظم کو بھی شامل کر دیا ہے۔ گل کرسٹ نے اپنی بات کی وضاحت کے لیے قدما کے اشعار شواہد کے طور پر پیش کیا ہے جہاں اس نے ذاتی قیاس کیا ہے اس میں چند لغزشوں کا بھی شکار بھی ہوا ہے۔ جیسے عیسوی کلنڈر کا تقابل مشرقی کیلنڈر سے کرنے کے نتیجے میں March کی وضاحت ربیع الاول اور بارہ وفات اور September کو ماہ صیام اور روزے کا چاند۔ لکھا ہے۔ اسی طرح تاریخی غلطیوں میں ملکہ نور جہاں کو شاہ جہاں کی بیوی بھی لکھا ہے۔

بعض الفاظ کی تفہیم میں اشعار، محاورات و ضرب الامثال سے بھی کی گئی ہے۔ جیسے:

bitten کی مفہوم کی وضاحت اس طرح کی ہے۔ سانپ کا کاٹا سوئے ۔۔ بچھی کا کاٹا روئے

اسی طرح بہت سے الفاظ کا مختلف تلفظ بھی دیا گیا ہے جسے عوام مختلف طرح مختلف مقامات پر ادا کرتے ہیں جیسے: سسر۔ سسر۔ سسر۔ اور سکھن۔ سخن۔ سخن۔ سخن۔

گلکرسٹ کی لغت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ہر مترادف کے ساتھ اس کی اصلی زبان کا مخفف بھی دیا ہے جیسے ۔عربی کے لیے ''a'' فارسی سے لیے ''p'' ہندی کے لیے ''h'' دیا ہے۔

گلکرسٹ کی لغت ہندوستانی ڈکشنری کا کمزور ترین پہلو تعصبانہ طرز فکر بھی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے ہندوستانیوں اور انگریزوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ انگریزوں کو ہندوستانیوں سے محتاط رہنے کی ہدایت دی ہے۔ مسعود ہاشمی نے اسے ''ہدایت نامہ فرہنگ'' بھی کہا ہے۔

مجموعی طور پر گلکرسٹ کی ڈکشنری اردو لغت کے ارتقا میں اہمیت کی حامل ہے۔ ابتدائی کام میں خامیوں کے پائے جانے کا امکان ہوتا ہے۔ لیکن ان کی وجوہات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں lack of perspective اور مواد اور ماہرین فن کی عدم دستیابی جیسے مشکل امور کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے علاوہ ڈکشنری کی تیاری فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے ہوئی تھی جبکہ ابھی ماہرین فن کو یکجا نہیں کیا گیا تھا۔

جان ۔ ٹی ۔ پلیٹس ۔ (Platts) گلکرسٹ کے بعد ایک اہم لغت نویس ہے ۔ اس کی لغت A Dictionary of urdu classical Hindi & English ہے اس لغت نے آئندہ آنے والوں کے لیے راہیں متعین کیں۔ اپنی لغت کے جواز میں پلیٹس نے متقدمین کی لغزشوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ وہ لکھتا ہے فاربس کی لغت کی تالیف کے بعد مزید نئے الفاظ وجود میں آئے ۔ بیٹس (Bates) کی لغت ماخذ لسانی کا تعین نہیں کر سکتی۔ فیلن کی لغت میں ادبی گریز پائی اور الفا ظ و محاورات کی عدم شمولیت جیسی خامیاں ہیں۔

پلیٹس کی لغت اصل میں اردو، انگریزی ہے۔ ہندی کو اس کی ضمنی اور ثانوی حیثیت ہے ۔ ڈاکٹر نذیر آزاد رقم طراز ہیں '' کہ اندراجات کی ترتیب میں یہ لغت جدید لغت نگاری کے نقیب کی حیثیت رکھتی ہے۔'' اس لغت میں مفردات کے علاوہ لاحقوں سے بننے والے مرکبات کو اندراج کیا گیا ہے جیسے زمین سے زمیندار۔ زمینداری۔ وغیرہ اسی طرح یکساں املا لیکن تلفظ اور معنی کی بنیاد پر الفاظ کو الگ الگ درج کیا گیا ہے۔ مثلاً مظہر (اسم فاعل بمعنی ظاہر کرنے والا) مظہر (اسم مفعول بمعنی ظاہر کیا ہوا) اور مظہر (اسم ظرف بمعنی ظاہر ہونے کی جگہ) کو الگ الگ راس لفظ کے طور پر لکھا گیا ہے اسی طرح الفاظ کی معیاری (Standard) عوامی (vulgar) اور بگڑی ہوئی شکل (Corrupt) بھی دی گئی ہے۔ ۔ ڈاکٹر حنیف کیفی اس لغت

کے بارے میں لکھتے ہیں

''یہ لغت سازی کے سائنسی اصولوں کی بدولت نہ صرف انگریزی کے زبان دانوں بلکہ اردو کے اہل زبان کے لیے بھی ایک نمونہ ہے''۔

(اردو لغت نگاری روایت وارتقا،ص۔ ۱۷۱)

پلیٹس کی خوبیوں کے باوصف اس کی خامیوں پر بھی نکتہ چینی کی گئی ہے۔وارث سرہندی پلیٹس کی لغت کے بارے میں لکھتے ہے'' علوم شعری میں عدم مزاولت کی بری مثال ہے اصناف سخن کا صحیح درک اس میں مفقود ہے یہ اس کا کمزور پہلو ہے''۔(ایضاً ص۔۱۷۳)

مجموعی طور پر پلیٹس کی لغت کی یہ خوبی ہے کہ اس کی لغت کا مقصد نہ سیاسی نہ تجارتی تھا بلکہ خالص تعلیمی اور لسانی مقاصد کو سامنے رکھ کر اس نے لغت لکھی مزید خوبی یہ ہے کہ اس کو اپنی غلطیوں کی اصلاح میں کسی بھی قسم کی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔

کپتان جوزف ٹیلر نے ایک لغت A Dictionary Hindoostani and English اپنے ذاتی استعمال کے لیے 1805ء میں لکھی تھی۔ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے اساتذہ کی مدد سے 1808ء میں شائع کیا۔اس لغت کو بنیاد بنا کر جان شکسپر نے ہندوستانی انگریزی ڈکشنری کا پہلا ایڈیشن 1817ء میں شائع کیا بعد میں 1834ء میں جو ایڈیشن شائع ہوا اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام انگریزی الفاظ اشاریے میں جمع کیے گیے ہیں جو اردو الفاظ کے مترادفات کے طور اصل لغت میں درج ہیں۔1849ء میں چوتھا ایڈیشن شائع ہوا جس میں اشاریے کو باضابطہ طور پر لغت (انگریزی اردو) میں تبدیل کیا گیا۔یعنی یہ تالیف ہندوستانی۔انگریزی اور انگریزی۔ہندوستانی ڈکشنری،یعنی دو لغات کی ایک جامع شکل اختیار کرگئی۔یہ لغت اپنے وقت کی ایک جامع لغت تھی۔

اس روایت کے ارتقا میں جے ٹی ٹامسن کی انگریزی۔اردو ڈکشنری (1836) اے۔سی۔ڈی۔روزاریو کی انگریزی۔بنگالی۔اردو۔سہ لسانی ڈکشنری (1837) کپتان رابرٹ شیڈون ڈولی کی جیبی انگریزی۔ہندوستانی۔ڈکشنری (1846) این براٹس کی مدون کردہ ہندوستانی۔انگریزی ڈکشنری (1847 کلکتہ) ولیم ییٹس کی ہندوستانی۔انگریزی ڈکشنری (1847 لندن) قابل ذکر ہیں۔

ڈنکن فاربس (Duncan Forbes) کی Dictionary Hindustani and English 1848ء میں لندن سے شائع ہوئی۔اس ڈکشنری کی خصوصیت اور اہمیت پر اظہار کرتے ہوئے نذیر آزاد لکھتے ہیں۔

'' فاربس کی محنت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس لغت کے اردو ہندی ماخذات میں مستشرقین کی تصنیفات مثلاً ولیم ہنٹر کی ہندوستانی انگریزی ڈکشنری (1808 کلکتہ) گل کرسٹ کی کتاب Hindee moral Preceptor (لندن 1821) گلیڈون کی فرہنگ Dictionary of Mohamedan law and Bengal Revenueterms (کلکتہ 1767) H.M Eliot کی AGlossary of Indian Terms اور ڈاکٹر آدم کی Hindi Dictionary کے علاوہ ہندوستانی مصنفین کی کتابیں مثلاً ''پریم ساگر'' (ہندی) انوار سہیلی (دکنی) اور قانون اسلام (اردو) وغیرہ شامل ہیں۔(بحوالہ اردو لغت نگاری: روایت وارتقا ص ۱۹۹)

Dr.S.W.Fallon کی Hindustani -English Dictionary بنارس اور لندن سے 1879ء میں شائع ہوئی۔یہ لغت جدید اصولوں پر مبنی ہے اور پہلی بار اس میں بول چال کی زبان،عورتوں کی زبان،گیتوں،کہاوتوں،پہیلیوں اور لوک کہانیوں سے ماخوذ الفاظ استعمال کیے گیے ہیں۔عوامی بول چال سے قریب ہونے کی وجہ سے علمی وادبی الفاظ پر زیادہ زور نہیں دیا گیا ہے۔فارسی اور عربی الفاظ کے تلفظ اور ماخذ کے حوالے سے غلط نتائج اخذ کیے گیے۔فحش الفاظ کے اندراج کی وجہ سے پہلے تنازع کا شکار بھی رہی بعد میں جدید اصولوں کی رو سے وہی خامی خوبی

قرار دی گئی۔ڈاکٹر فیلن کی ایک اور ڈکشنری ''انگلش ہندوستانی ڈکشنری 1883 ' ء میں لندن اور بنارس سے شائع ہوئی۔اس کی خوبی یہ ہے کہ انگریزی نظم ونثر کے اقتباسات اوران کے اردو ترجمے کیے گیے ۔اسی طرح انگریزی شاعری کے بہترین انتخاب کا اردو میں منظوم ترجمہ ممکن ہوا۔اس کے علاوہ یورپی آرٹ،فلسفہ اور سائنس کی اصطلاحات کو عام ہندوستانی میں ترجمہ کیا گیا۔

درجہ بالا مستشرقین کی خدمات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ذولسانی اور سہ لسانی لغات کا یہ دور اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ ان لغات کے مولفین کے ساتھ کچھ ایسے ہندوستانی مولفین جیسے چرنجی لال،مولف مخزن المحاورات اور سید احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ نے مغربی لغت نویسی کے اصولوں سے استفادہ کیا۔اس طرح اردو لغت کے لیے بھی راہیں ہموار ہوئیں ۔اور مستشرقین نے بڑی محنت اور جدو جہد سے لغت نویسی کے کام میں بہت حد تک دیانت وامانت سے کام لیا اور اردو لغت نویسی کے لیے مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔

☆☆☆

اردو اسکالرس کی دنیا

International Refereed Journal for Urdu Literature

EISSN: 2320-8910, ISSN: 2320-5369

Volume VII, Issue I, February 2019

URDU SCHOLARS KI DUNIYA-IRJU

IMPACT FACTOR: 0.383

INDEXING:
Cosmos Impact Factor-Berlin Brandenburg, Kleinmachnow- Germany
Ulrich's Web- Global Series Directory, USA
Directory of Research Journals Indexing, India
Open J- Gate, India
Pub_Res_ (International Research Library)
Yumpu-Gewerbestrasse-Diepoldsau- Switzerland

MAAZ PUBLICATIONS ▪ Malegaon▪ MAHARASHTRA▪ INDIA

چیف ایڈیٹر

پروفیسر محمد غیاث الدین

سابق صدر شعبۂ اردو، ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر مراٹھواڑا یونیورسٹی، اورنگ آباد (بھارت)

ایڈیٹر

ڈاکٹر سلمان بھٹی

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن لاہور (پاکستان)

مینیجنگ ایڈیٹر

اشتیاق احمد

(بھارت)

مجلس مشاورت

ڈاکٹر حلیل احمد ٹوکر

پروفیسر وصدر شعبۂ اردو، استنبول یونیورسٹی

استنبول۔ترکی

ڈاکٹر سمیر عبدالحمید

پروفیسر، اورینٹل لینگویج اسٹڈیز، ڈپٹی ڈائریکٹر

CISMOR Doshisha University Kyoto - Japan

ڈاکٹر ڈرمس بلغار

ایسوسیٹ پروفیسر، شعبۂ اردو،

استنبول یونیورسٹی۔ترکی

مسٹر نصیر ملك

ڈائریکٹر، آرٹ لینڈ، گرلس کالج روڈ، ڈسٹرکٹ لیہ

پنجاب۔پاکستان

ڈاکٹر آئیکوت کشمیر

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

انقرہ یونی ورسٹی انقرہ۔ترکی

ڈاکٹر اطہر سلطانہ

ایسوسیٹ پروفیسر وپرنسپل، یونیورسٹی کالج آف آرٹس وسوشل اسٹڈیز

تلنگانہ یونیورسٹی، نظام آباد، تلنگانہ۔بھارت

ڈاکٹر محمد محمود الاسلام

ایسوسیٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف ڈھاکہ۔بنگلہ دیش

ڈاکٹر یعقوب علی خان

ایسوسیٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی۔بھارت

فہرست

1	اردو اور ترکی زبان کا تاریخی تعامل ڈاکٹر آئیکوت کشمیر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، انقرہ یونی ورسٹی، انقرہ۔ ترکی	01-04
2	ہرمن ہیسے کے ہیرو سدھارتھ کے سماجی مسائل اور فکری پیچیدگیوں پر ایک نظر محمد فرید، لیکچرار، او پی ایف بوائز کالج، ایچ ایٹ فور، اسلام آباد۔ پاکستان	05-09
3	غالب کا پسندیدہ شاعر۔۔۔ مومن خاں مومن ڈاکٹر عقیلہ سید غوث، پرنسپل، آرٹس اینڈ کامرس مہیلا کالج، امباجوگی، ضلع بیڑ، مہاراشٹر۔ انڈیا	10-12
4	شمس الرحمٰن فاروقی کی افسانے کی نظری تنقید نسیم عباس احمر، لیکچرار، شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا۔ پاکستان	13-16
5	کشمیر میں فارسی ادب کا جائزہ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ فارسی، گورنمنٹ پی جی کالج، بھدرواہ، جموں وکشمیر۔ انڈیا	17-20
6	واجدہ تبسم، فرخندہ لودھی اور طاہرہ اقبال کے افسانوں کا تقابلی جائزہ (تانیثیت کے تناظر میں) ڈاکٹر میمونہ سبحانی، اسسٹنٹ پروفیسر، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد۔ پاکستان	21-26
7	لسانی، سماجی، ثقافتی، فنی، مطالعہ اور زبان اردو ڈاکٹر پٹیل شبینہ بیگم مجاہد، شردچندرا مہاودھالیہ، سرڈن، تعلقہ کلم، عثمان آباد، مہاراشٹر۔ انڈیا	27-30
8	سعید نظر کے کلام میں مہجری ادب کی جھلکیاں ڈاکٹر محمد نثار احمد، شعبہ اردو، وی یونیورسٹی، تروپتی، آندھرا پردیش۔ انڈیا	31-34
9	کڈپہ کے شعری دبستان کی شناخت اور امکانات ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، رائے چوٹی۔ اے پی۔ انڈیا	35-38
10	اردو شاعری میں بھگوان سری کرشن کا ذکر ڈاکٹر شیخ حسینہ بیگم، شعبہ اردو، ایس۔ وی یونیورسٹی، تروپتی، آندھرا پردیش۔ انڈیا	39-43
11	نظم حماد میں رنگینئ قوس وقزح (مولانا ابوالبیان حماد عمری) ڈاکٹر شیخ فاروق باشا، لیکچرر، شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، رائچوٹی، آندھرا پردیش۔ انڈیا	44-47

ISSN 2320-5369, EISSN 2320-8910
IF: Global Impact Factor: 0.383

نظمِ حماد میں رنگینیٔ قوس وقزح (مولانا ابوالبیان حماد عمری)

ڈاکٹر شیخ فاروق باشا
لکچرر، شعبہء اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، راچوٹی، آندھراپردیش۔انڈیا

قیام انجمن پنجاب کے بعد اردو نظم نگاری کا قافلہ مولانا الطاف حسین حالی، محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی نعمانی جیسے اکابرین ادب کی قیادت میں مستقبل کی طرف جو گامزن ہوا تو اس کی تیز اور دھیمی رفتار نے بہت سے نشیب وفراز دیکھے۔علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی اور ان کے معاصرین نے اس قافلے کو ایک نئ سمت ورفتار، توانائی واستحکام، اسلوب بیان کی ندرت، موضوعاتی وسعت، فکری بالیدگی، شعور کی پختگی عطا کی اور ایسے مقام پر لا کھڑا کیا جہاں سے اس کا مستقبل روشن نظر آنے لگا۔مولانا ابوالبیان حماد عمری اسی قافلے کے ایک اہم رکن رکین ہیں۔

مولانا بنیادی طور پر مدرس ہیں لیکن اپنی شاعری کی بدولت نہ صرف برصغیر بلکہ بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں اردو زبان کے مقتدر اور معیاری جرائد ورسائل میں آپ کا کلام زیور طباعت سے آراستہ ہو کر داد وتحسین حاصل کر چکا ہے۔گذشتہ نصف صدی سے آپ کا آفتاب شاعری آسمان اردو پر جگمگا رہا ہے۔''بانگ حرا'' آپ کی نظموں کا مجموعہ کلام ہے جس میں چند حمد ونعت کے گلدستے اور دیڑھ سو سے زائد خالص نظمیں شامل ہیں۔اس سے قبل آپ کی نعتوں کا پہلا مجموعہء کلام شائع ہو کر مقبول عام ہو چکا ہے۔

''بانگ حرا'' کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے مولانا کہتے ہیں۔حامل قرآن، خلوت نشین، غار حرا سے مجھے گہری عقیدت ومحبت ہے اس بنا پر مجموعہء کلام کا نام ''بانگ حرا'' مناسب معلوم ہوا۔

مولانا کو علامہ اقبال سے گہری عقیدت ومحبت ہے۔یہی وجہ ہے کہ فکر اقبال کی کونپلیں یہاں بھی پھوٹتی نظر آتی ہیں۔علامہ اقبال سے الفت کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں۔۔

خدا نے بخشا ہے حماد کو جو ذوق ادب ہے فیض حضرتِ شاکر ہے منتِ اقبال

علامہ اقبال نے اپنے کلام کے ذریعہ سوئی ہوئی قوم کو خواب غفلت سے جگایا اور ان میں عمل کی تحریک پیدا کی، انسانیت کو محبت کا درس دیا، نوجوانان اسلام کو مغربی تہذیب وکلچر سے اپنے دامن کو پاک وصاف رکھنے کی تلقین کی۔مولانا کے کلام میں بھی انہی افکار وخیالات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔مولانا کے کلام کی روانی، سلاست اور لفظیات کی بندش دیکھ کر کہیں کہیں اسلوب اقبال کا شائبہ ہونے لگتا ہے جیسے

یہ عزم ہمارا محکم ہے، یہ فیصلہ اپنا قطعی ہے
گرتوں کو اٹھا کر چھوڑیں گے سوتوں کو جگا کر چھوڑیں گے

دونوں کے کلام میں زندگی کا تقابل دیکھیے۔

اقبال۔ قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
حماد۔ زندگانی امتحاں ہے ہر بشر کے واسطے اک کسوٹی ہے عیار خیر وشر کے واسطے

اقبال۔ یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم — جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

حماد۔ سعئ پیہم، عزم محکم، چشم پرنم، درد وغم — اس طرح تیار ہوتا ہے قوام زندگی

مولانا ابوالبیان حماد عمری، جامعہ دارالسلام عمرآباد میں ایک طویل عرصہ درس وتدریس میں منہمک رہے۔ بحیثیت مفسر قرآن، شارح حدیث، آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ظاہر بات ہے جس کا اوڑھنا بچھونا مذہب ہو اس کی صدائے بازگشت کلام میں سنائی نہ دے یہ امر محال ہوگا۔ اسی لیے جا بجا ہمیں ان کے کلام میں حمد ونعت کے گلدستے اور اسلامی فکر کے تاروپود بہت گہرائی تک پیوست نظر آتے ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جس میں شان بندگی کچھ بھی نہ ہو وہ زندگی — ایک کرب مستقل ہے یا مسلسل اک عذاب

جائزہ لیتا ہے وہ ہر وقت اپنے نفس کا — مرد مومن کے لیے ہر روز ہے روز حساب

مذہب پسندی اور اسلامی رنگ مولانا کے کلام کی خاص خوبی ہے۔ لیکن ادبیت کے صاف وشفاف چشمے میں ڈھل کر کلام میں قوس وقزح کی رنگینی پیدا ہوگئی ہے۔

کوئی بھی شاعر اپنے دور کی بدلتی قدروں اور رجحانات ونظریات سے اپنے دامن کو تر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مولانا کے کلام میں عصریت اور وقت کی پکار کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ امید انقلاب صالح، وقت کا تقاضا، مسلم پرسنل لا، پیغام بیداری، دعوت عمل، حیات نو، دینی انقلاب، مرادآباد فسادات، ترانہء بنات المومنین، مسجد اقصی، زخم خوردہ ارض فلسطین، بابری مسجد کی شہادت، وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ مرادآباد کے فسادات پر آپ کی رگ حمیت پھڑک اٹھتی ہے۔ کہتے ہیں۔

چمن کی جن کو حفاظت مدام کرنا تھا — یہ کیا غضب ہے وہ صیاد بن گئے آخر

سنایا جایے کسے درد وغم کا افسانہ — قضات شہر ہی جلاد بن گئے آخر

مولانا کے مخاطبین میں سے ایک اہم طبقہ نوجوانوں کا ہے۔ جن سے انہیں ملک کی تعمیر اور اسلامی تہذیب کی حفاظت وصیانت کے تئیں بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ آپ کی نظمیں نوجوان طبقہ کے لیے رجائیت کی بہتی نہریں ثابت ہوگی۔ مایوسی اور قنوطیت کے بادل چھٹتے نظر آئیں گے۔ ترانہء دعوت عمل، پیغام بیداری، نوجوانوں سے خطاب، عزائم، کرنوں کا سفر، بنام طلبائے علم جیسی نظمیں اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔

نظم ''نوجوانوں سے خطاب'' میں کہتے ہیں۔

پھر زمانے کو پیام حق سنا اے نوجواں — خواب غفلت سے مسلماں کو جگا اے نوجواں

مشکلات راہ سے ہرگز نہ گھبرا تو کبھی — جانب منزل قدم اپنا بڑھا اے نوجواں

اتحاد وامن کا پیغام دے انسان کو — ٹوٹنے والوں کو آپس میں ملا اے نوجواں

نظم کے ابتدائی دور میں مقصدیت اور افادیت کا غلبہ رہا۔ پھر رومانیت اور جدیدیت کا زور رہا، اخترالایمان کا استعاراتی نظام، ن م راشد کا علامتی اسلوب، ندا فاضلی کا بیانیہ عنصر اردو نظم کے مختلف اسالیب ہیں۔ مولانا کا اسلوب بیانیہ ہے لیکن اس میں جذباتی، احساساتی اور جمالیاتی عناصر کا بھی حسین امتزاج بھی ملتا ہے۔ نظم حرف تمنا کے یہ اشعار دیکھیے۔

میں کبھی باطل کی ہاں میں ہاں ملا سکتا نہیں — سر کٹا سکتا ہوں لیکن سر جھکا سکتا نہیں

جانے کب دنیا میں آئے انقلاب خوشگوار — یہ جہان کہنہ مجھ کو راس آ سکتا نہیں

مجھ پہ یہ عالم گزرتا ہے محبت میں کبھی — یاد کر سکتا نہیں ان کو بھلا سکتا نہیں

اقبال۔ یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

حماد۔ سعیٔ پیہم، عزم محکم، چشم پرنم، دردوغم اس طرح تیار ہوتا ہے قوام زندگی

مولانا ابوالبیان حماد عمری، جامعہ دارالسلام عمرآباد میں ایک طویل عرصہ درس وتدریس میں منہمک رہے۔ بحیثیت مفسر قرآن، شارح حدیث، آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ظاہر بات ہے جس کا اوڑھنا بچھونا مذہب ہو اس کی صدائے بازگشت کلام میں سنائی نہ دے یہ امر محال ہوگا۔ اسی لیے جا بجا ہمیں ان کے کلام میں حمد ونعت کے گلدستے اور اسلامی فکر کے تاروپود بہت گہرائی تک پیوست نظر آتے ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جس میں شان بندگی کچھ بھی نہ ہو وہ زندگی ایک کرب مستقل ہے یا مسلسل اک عذاب

جائزہ لیتا ہے وہ ہر وقت اپنے نفس کا مردِ مومن کے لیے ہر روز ہے روز حساب

مذہب پسندی اور اسلامی رنگ مولانا کے کلام کی خاص خوبی ہے۔ لیکن ادبیت کے صاف وشفاف چشمے میں ڈھل کر کلام میں قوس وقزح کی رنگینی پیدا ہوگئی ہے۔

کوئی بھی شاعر اپنے دور کی بدلتی قدروں اور رجحانات ونظریات سے اپنے دامن کو تر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مولانا کے کلام میں عصریت اور وقت کی پکار کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ امید انقلابِ صالح، وقت کا تقاضا، مسلم پرسنل لا، پیغام بیداری، دعوت عمل، حیات نو، دینی انقلاب، مرادآباد فسادات ، ترانۂ بنات المومنین، مسجد اقصیٰ، زخم خوردہ ارض فلسطین، بابری مسجد کی شہادت، وغیرہ اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ مرادآباد کے فسادات پر آپ کی رگ حمیت پھڑک اٹھتی ہے۔ کہتے ہیں۔

چمن کی جن کو حفاظت مدام کرنا تھا یہ کیا غضب ہے وہ صیاد بن گئے آخر

سنایا جائے کسے دردوغم کا افسانہ قضاتِ شہر ہی جلاد بن گئے آخر

مولانا کے مخاطبین میں سے ایک اہم طبقہ نوجوانوں کا ہے۔ جن سے انہیں ملک کی تعمیر اور اسلامی تہذیب کی حفاظت وصیانت کے تئیں بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ آپ کی نظمیں نوجوان طبقہ کے لیے رجائیت کی بہتی نہریں ثابت ہوگی۔ مایوسی اور قنوطیت کے بادل چھٹتے نظر آئیں گے ۔ ترانۂ دعوت عمل ، پیغام بیداری، نوجوانوں سے خطاب، عزائم، کرنوں کا سفر، بنام طلبائے علم جیسی نظمیں اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔

نظم ''نوجوانوں سے خطاب'' میں کہتے ہیں۔

پھر زمانے کو پیام حق سنا اے نوجواں خواب غفلت سے مسلماں کو جگا اے نوجواں

مشکلات راہ سے ہرگز نہ گھبرا تو کبھی جانب منزل قدم اپنا بڑھا اے نوجواں

اتحاد وامن کا پیغام دے انسان کو ٹوٹنے والوں کو آپس میں ملا اے نوجواں

نظم کے ابتدائی دور میں مقصدیت اور افادیت کا غلبہ رہا۔ پھر رومانیت اور جدیدیت کا زور رہا، اختر الایمان کا استعاراتی نظام، ن م راشد کا علامتی اسلوب، ندا فاضلی کا بیانیہ عنصر اردو نظم کے مختلف اسالیب ہیں۔ مولانا کا اسلوب بیانیہ ہے لیکن اس میں جذباتی، احساساتی اور جمالیاتی عناصر کا بھی حسین امتزاج بھی ملتا ہے ۔ نظم حرف تمنا کے یہ اشعار دیکھیے۔

میں کبھی باطل کی ہاں میں ہاں ملا سکتا نہیں سر کٹا سکتا ہوں لیکن سر جھکا سکتا نہیں

جانے کب دنیا میں آئے انقلاب خوشگوار یہ جہان کہنہ مجھ کو راس آ سکتا نہیں

مجھ پہ یہ عالم گزرتا ہے محبت میں کبھی یاد کر سکتا نہیں ان کو بھلا سکتا نہیں

بانگ حرا میں مختصری مختصر بحریں بھی اور طیل سے طویل بحریں بھی ہیں جن کے مطالعے سے بحروں پر مولانا کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً، کہتے ہیں:

زیست کا حاصل ہے تو جو ہر قابل ہے تو
شاید عادل ہے تو رہبر کامل ہے تو
سرور منزل ہے تو رونق محفل ہے تو
جاگ مسلمان جاگ چھیڑ محبت کے راگ

طویل بحر کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

نبض دوراں بھی کچھ دیر رک جائے گی چلتے چلتے جہاں ہم ٹھہر جائیں گے
ہم جو چاہیں سمت جائیں گے فاصلے سب ادھر جائیں گے ہم جدھر جائیں گے

مولانا کے کلام میں موضوعات کی فراوانی ،عصری حسیت ،متعلقات زندگی جیسے سماجی و معاشی ،اصلاحی و اخلاقی ،سیاسی و مذہبی ،تہذیبی و تمدنی ،تاریخی و ثقافتی ،اخلاقی و اقداری ،سیاسی و تحریکی جیسے موضوعات حقیقت کے آئینے میں صاف نظر آتے ہیں۔ حقیقت نگاری مولانا کی نظموں کی ایک خاص خوبی ہے۔وہ بلند بانگ دعوؤں پر یقین نہیں رکھتے بلکہ زندگی کے ان مسائل کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں جوان کے اپنے بس میں ہوتے ہیں۔اپنی شاعری کے تعلق سے کہتے ہیں:

میں نقیب انقلاب دین ہوں شاعر نہیں میرا پیغام حقیقت وقت کی آواز ہے

بانگ حرا مجموعہ میں بعض نظمیں ایسی بھی ہیں جن کی اصل عربی زبان یا فارسی ہے آپ نے بے حد خوبصورتی سے اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے ۔جس سے اردو عربی اور فارسی زبانوں پر آپ کی دستگاہ کا علم ہوتا ہے۔

علامہ اقبال کی ایک فارسی نظم ''حدی'' جاوید نامہ میں مذکور ہے جس میں عربوں کی اونٹوں کی دوڑ کا ایک نقشہ کھینچا گیا ہے۔مولانا نے اسی زمین میں اردو میں ''نغمۂ ساربان'' کے عنوان سے بہت خوبی سے منظوم ترجمہ کیا ہے۔ملاحظہ ہو:

تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست دلکش وزیباستی
شاہد رعناستی روکش حوراستی
غیرت لیلاستی دختر صحراستی
تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست

مولانا نے اسی زمین میں منظوم ترجمہ کیا ہے۔کہتے ہیں:

تیز قدم رکھ تیز قدم رکھ اپنی منزل دور نہیں ہے
شکل میں ہے کتنی خوبی تیری ہستی سب کو پیاری
تجھ پر قرباں حور بہشتی لیلی بھی ہے تیری فدائی
جنگل کی ہے دوشیزہ بھی
تیز قدم رکھ تیز قدم رکھ اپنی منزل دور نہیں ہے

اسی طرح مصر کا مشہور نابینا شاعر طہ حسین ''انہ طفل ضریر'' ایک اندھے بچے کی فریاد وفغاں'' کے نام سے ایک نظم لکھی جس میں ایک نابینا بچہ کے جذبات

واحساسات کو بے حد موثر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے جسے ساری دنیا میں پسند کیا گیا۔ دنیا کے بیشتر عربی مدارس میں اسے شامل نصاب کیا گیا۔ مولانا نے اسی خوبصورتی سے اردو زبان میں منظوم کیا ہے۔ عربی اور اردو جاننے والے اس کی تاثیر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ طہٰ حسین کے اشعار ہیں۔

یا امی ماشکل السماء — وما الضیاء وما القمر
بجمالھا تتحدثون — ولا اری منھا اثر
وانا ضریر قاعد — فی عقر داری مستقر
واللہ یلطف بی — ویصرف ما اقاسی من کدر

منظوم ترجمہ ملاحظہ ہو۔

اے مری مادر مہرباں سن لے مری عرضِ بیاں — یہ روشنی، یہ چاند کیا، کیسی ہے، شکل آسماں
سنتا ہوں میں تم سے بہت ذکر جمال کائنات — لیکن مجھے اس کا نظر آتا نہیں کچھ بھی بیاں
اندھا جو ہوں بیٹھا ہوا رہتا ہوں میں گھر میں صدا — مجبور ہوں معذور ہوں اس حال میں جاؤں کہاں
اللہ کا فضل و کرم مجھ پر کبھی ہوگا ضرور — اس کے سوا میرے لیے ہے کون آخر مہرباں

غرض مولانا ابوالبیان حماد نے اردو نظم کے دائرے کو وسعت بخشی ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد جو اہم شعراء ہیں ان میں امتیاز رکھتے ہیں۔ مولانا کی نظموں میں صالح فکر و عمل کے نغمے ہیں، قلوب و اذہان کو معطر کر دینے والے خوش فکر شاعری کے گلدستے ہیں، رجائیت و نو امیدی کی بہتی نہریں ہیں۔ اسلوب بیان کی چاشنی اور شگفتگی ہم کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔

☆☆☆

آندھراپردیش اسٹیٹ اردو اکیڈمی، محکمۂ اقلیتی بہبود، حکومتِ آندھراپردیش

یادگاری مجلّہ

ساونیر

مولانا ابوالکلام آزادؒ

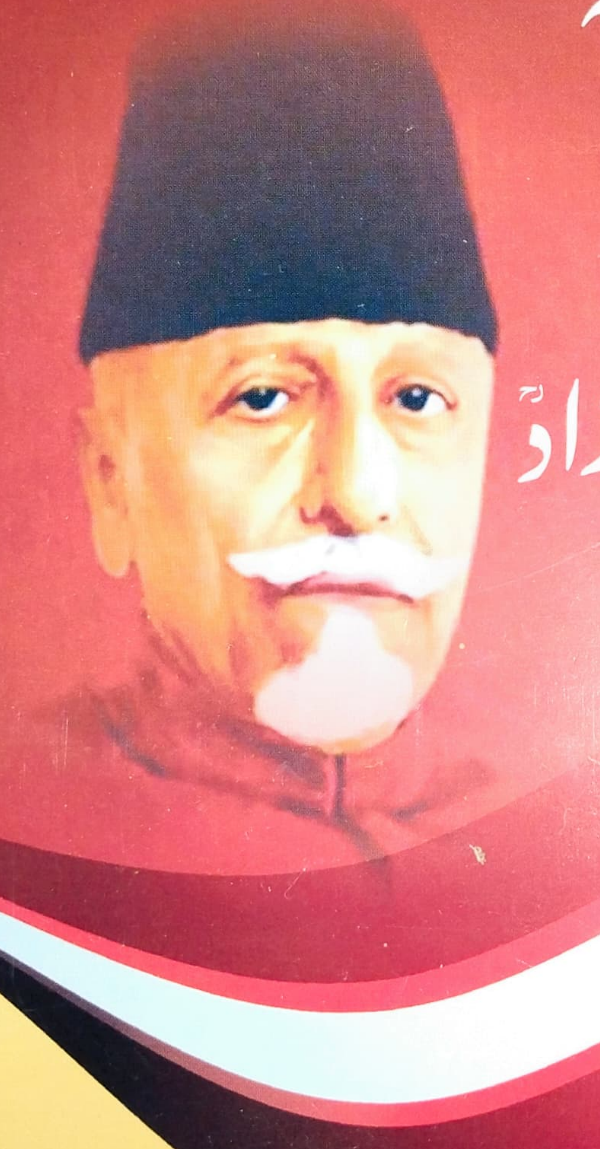

بتاریخ 11رنومبر 2018ء مولانا آزاد کا 131ویں یومِ ولادت
قومی یومِ تعلیم اور یومِ اقلیتی بہبود کے موقعہ پر شائع کردہ یادگاری مجلہ

آندھراپردیش اسٹیٹ اردو اکیڈمی، وجۓ واڑہ

A.P STATE URDU ACADEMY

فہرست

۱	عرضِ مرتب	ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری	7
۲	مولانا آزاد ایک عظیم مفکر و دیدہ ور	پروفیسر ایس ایم رحمت اللہ	8
۳	مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی خدمات	پروفیسر ستار ساحر	13
۴	ابوالکلام آزاد اور ان کا شاہکار ترجمان القرآن	ڈاکٹر سید وحید کوثر	17
۵	سیکولر ہندوستان کے معمار مولانا آزاد	ڈاکٹر سید نجی اللہ	22
۶	مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت صحافی	ڈاکٹر محمد نثار احمد	26
۷	مولانا آزاد کی تحریروں میں طنز و مزاح	ڈاکٹر محمد امین اللہ	30
۸	میں ابوالکلام آزاد ہوں	ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی	34
۹	مولانا آزاد اور فلاحِ انسانیت	ڈاکٹر نشاط احمد عمری	38
۱۰	مولانا آزاد اور مولانا محمد علی جوہر	ڈاکٹر شیخ فاروق باشا عمری	40
۱۱	مولانا آزاد بحیثیت وزیر تعلیم	ڈاکٹر ایس محمد یاسر	46
۱۲	مولانا آزاد۔نہرو کی نظر میں	ڈاکٹر شاذیہ بیگم	50
۱۳	مولانا آزاد کے تعلیمی تصورات	محمد فیض اللہ	53
۱۴	مولانا آزاد بحیثیت شاعر	ڈاکٹر سید فتح اللہ بختیاری عمری	59
۱۵	مولانا ابوالکلام آزاد کا فنِ حدیث میں تبحر	ڈاکٹر ابوبکر ابراہیم عمری	62
۱۶	امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی شانِ خطابت	محمد نقی اللہ خان	65
۱۷	سیکولرازم اور متحدہ قومیت کے علمبردار	ش م. ہاشم طلیق عمری	72
۱۸	مولانا آزاد بحیثیت ماہر تعلیم	ستار فیضی	78
۱۹	مولانا آزاد مکاتیب کے آئینے میں	ایس.ٹی نوراللہ	81
۲۰	مولانا آزاد کا شعری شغف	سردار ساحل	85
۲۱	مولانا آزاد کی خدماتِ جلیلہ	سید شکیل احمد شکیل	88
۲۲	مولانا آزاد بحیثیت مجاہدِ آزادی	امام قاسم ساقی	90
۲۳	مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن	حافظ ڈی.عبدالعلیم عمری	92
۲۴	مولانا آزاد کی تفسیر اور اس کا انتساب	شاہ جہاں بیگم گوہر کرنولی	95
۲۵	سیاسی شعور کی بیداری میں الہلال کا کردار	شیخ انور ہادی	100
۲۶	مولانا آزاد کی نظر میں اسلام کا پیغامِ امن	ڈاکٹر حکیم رئیس فاطمہ	103
۲۷	مولانا آزاد کا سیاسی رول	ڈاکٹر آمنہ آفرین	105
۲۸	مولانا آزاد: ملت کے غم گسار	رفعت آسیہ شاہین	107
۲۹	مولانا آزاد پر تحقیق کے امکانات	ظہیر دانش عمری	109
۳۰	آزاد شناسی کے لوازم اور فکرِ آزاد کی معنویت	ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری	112

ڈاکٹر شیخ فاروق باشاعمری
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، رائے چوٹی

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا محمد علی جوہر

ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلمانوں کا رول نہایت واضح اور دوٹوک رہا ہے۔ مسلمان اپنے رہنماؤں کی رہبری میں ہندوستانی اقلیتی طبقے ہونے کے باوجود اکثریتی طبقہ سے کہیں بڑھ کر جان و مال کی قربانی پیش کی۔ مسلمانوں میں قومیت، وطنیت اور جذبہء حریت پیدا کرنے میں جن اہم قائدین کا رول رہا ہے ان میں سرفہرست امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور رئیس الاحرار مولانا محمد جوہر ہیں۔

خدا نے ان دونوں قائدین کو بے شمار صلاحیتوں اور لیاقتوں سے نوازا تھا۔ تقریر ہو یا تحریر، صحافت ہو یا سیاست، قیادت ہو یا امامت، نظم ہو یا نثر، ہر میدان کے وہ ماہر تھے، سب سے بڑھ کر دونوں جذبہء ایمانی سے سرشار تھے۔ کبھی انہوں نے اپنے ذاتی مفاد کے لیے کسی سے سمجھوتہ نہ کیا۔ اور نہ دشمنوں کے آگے سرِ تسلیم خم کیا۔ اپنی بے پناہ صلاحیتوں کے باعث وہ چاہتے تو ان کو انگریزی حکومت میں بڑے سے بڑا عہدہ پا سکتے تھے۔ اور ان کی زندگی شاہانہ گزر سکتی تھی لیکن انہوں نے فقیری اور اسیری کی زندگی کو محبوب جانا۔

بیسویں صدی کے اوائل میں حالات شدید انتشار سے دوچار تھے۔ ہندوستانیوں کے لیے ہر قدم پر کانٹے بچھے ہوئے تھے۔ ان حالات میں صحافت کی پرخار وادی میں قدم رکھنا اپنے لیے موت کو دعوت دینا تھا۔ محمد علی جوہر آزاد سے دس سال بڑے تھے۔ چنانچہ ان کو صحافت کے میدان میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ وہ انگریزی زبان پر بے پناہ قدرت رکھتے تھے۔ چنانچہ قوم و ملک کی خدمت کے لیے انہوں نے کامریڈ کے نام سے ۱۴، اجنوری ۱۹۱۱ء میں کلکتہ سے ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ جسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہندوستانیوں کے دل جیت ہی لیے لیکن اہل زبان انگریز بھی مولانا کے اسلوب پر فریفتہ ہو گیے اور بے چینی سے اخبار کی راہ تکتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتہ سے ''الہلال'' اخبار جاری کیا۔ جس کے عزائم جتنے بلند تھے زبان و اسلوب بھی اتنا ہی دلکش اور پرتاثیر تھا مولانا آزاد نے بھی صحافت کے ذریعے قوم ملت کی خدمت اور اہل ہند میں جذبہء حریت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ الہلال میں لکھتے ہیں۔ ''ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاش زیاں ونقصان کے لیے آئے ہیں۔ صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلبگار ہیں، عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔'' (ایوان اردو، دہلی دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۴۸)

جس طرح مولانا محمد علی کی انگریزی نے ساری دنیا میں دھوم مچادی اسی طرح مولانا آزاد کی نثر نے حیات آفرین کا درجہ پایا۔ مولانا آزاد کی اردو نثر کے تقابل میں مولانا محمد علی تو کیا کوئی بھی اہل قلم دور دور تک ان کا ہم سایہ نظر نہیں آتا ہے۔

''الہلال اور ہمدرد'' نے اردو صحافت کو ایک نیا معیار عطا کیا۔ قوم دوستی، حب الوطنی، سیاسی بیداری کے جذبات پیدا کیے۔ باطل اوہام اور فرسودہ تصورات کا قلع قمع کیا۔ اہل ہند کے دلوں میں تحریک آزادی کی روح پھونک دی دونوں اخباروں نے کھل کر ہندو مسلم اتحاد اور یکجہتی کا سبق پڑھایا محمد علی اپنے اخبار ہمدرد میں اتحاد کے تعلق سے مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ بیان جاری کیا۔

''اس وقت کی اہم ترین ضرورت اتحاد ہے میں توقع کرتا ہوں کہ لیڈران چھوٹے چھوٹے اختلافات کو نظر انداز کردیں گے۔ اور وقت کا جو کچھ تقاضہ ہے اس کو پورا کرنے کے لیے تیار ہوں گے''۔ (ہمدرد ۲۴، نومبر ۱۹۲۴ء ص ۵)

ہندوستان کی تحریک آزادی کو تقویت پہنچانے میں تحریک خلافت کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس تحریک کے تاسیس گزاروں میں مولانا محمود الحسن اور مولانا عبد الباری ہیں لیکن اس تحریک کو عام کرنے اور بلا تفریق مذہب و ملت سارے ہندوستانیوں کو اس میں شمولیت کے لیے فضا تیار کرنے میں جہاں بہت سے علماء کا رول رہا ہے وہیں علی برادران اور مولانا ابوالکلام آزاد کی کاوشیں بھی نا قابل فراموش ہیں۔ خلافت تحریک کو اس وقت اور بھی استحکام ملا جب اس میں گاندھی جی بھی شریک ہوگیے۔ بالآخر یہی تحریک تحریک آزادی میں تبدیل ہوگئی۔ علی برادران اور تحریک خلافت ایک جاں دو قالب ہو گئے۔ یہ اشعار زبان زد خاص و عام تھے۔

بولیں اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ ہیں تیرے شوکت علی بھی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے میرے اگر سات بیٹے — کرتی سب کو خلافت پہ صدقے

مولانا آزاد اور مولانا محمد علی کو صحافت اور خطابت کی بدولت کئی بار جیل جانا پڑا، قصور صرف یہ تھا کہ دونوں صحافت کے ذریعہ ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی کی روح پھونک رہے تھے اور مکمل آزادی کا مطالبہ کررہے تھے۔ مولانا آزاد اپنی زندگی کے ۹/سال ۷/مہینے زندان فرنگ میں رہے اور محمد علی تقریباً ۷/سال قید فرنگ میں رہے۔ ان دونوں بزرگوں نے قید کی زندگی کو ہنسی خوشی قبول کرلیا۔ مولانا آزاد ایک خط میں لکھتے ہیں۔ ''وقت کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے، اس پر نہیں کہ سات برس آٹھ مہینے قید و بند میں کیوں کٹے؟ اس پر کہ صرف سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں کٹے؟''۔ (ایوان اردو دہلی، دسمبر ۱۹۸۸ء ص ۴۲)

مولانا محمد علی اپنی اسیری کے ایام کو خوش قسمتی سے تعبیر کرتے ہیں۔

فیض سے تیرے ہی اے قید فرنگ — بال و پر نکلے قفس کے در کھلے

آزاد و جوہر خود دار طبیعت کے مالک تھے۔ قوم کے مفاد کی خاطر انہوں نے اپنے ذاتی مفاد کو قربان کردیا۔ دوران

اسیری مولانا آزاد نے اپنی رفیق حیات کی شدید علالت، رحلت اور آخری رسومات میں شرکت کے لیے درخواست دینے کو قوم کے مفاد کے مغائر اور اپنے لیے باعث ہزیمت سمجھا۔ اپنی وفا شعار بیوی کی ہمیشہ کی جدائی کو گوارا کرلیا لیکن حکام وقت کے آگے جھکنا پسند نہیں کیا۔ بالکل اسی طرح مولانا محمد علی بھی بیجاپور جیل میں محروس تھے بیٹی آمنہ شدید ترین مرض دق میں مبتلا تھیں اور اسی مرض میں وہ بھی اس دنیا سے رحلت کر گئیں۔ بیٹی کی وفات والد کے دل پر کیا قیامت ڈھائی ہوگی لیکن مولانا نے غم جدائی کو برداشت کرلیا۔ صبر و شکر اور تسلیم و رضا کا پیکر بنے رہے۔ اور کیا ہی خوب کہا۔

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

مولانا آزاد اور مولانا محمد علی کے مابین کئی چیزوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ صحافت، سیاست اور خطابت کی صلاحیتیں دونوں کے رگ پے میں سرایت کر گئیں تھیں۔ راسخ العقیدہ مذہبی پیروکار ہونے کے ساتھ حب الوطنی، قوم دوستی اور ملت کی خیر خواہی کے جذبات سے سرشار تھے۔ صاحب طرز ادیب، بلند پایہ نثر نگار اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ ایک کو شاعری میں تفوق ہے تو دوسرے کو نثر میں تقدم۔

مولانا آزاد اور جوہر کی نثر کا تقابل کیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی جوہر کے یہاں مولانا آزاد جیسا حُسن، دلکش اسلوب اور زور بیان نہیں لیکن خلوص، درد، تاثیر، عام فہمی اور سلاست اور دل نشینی میں یقیناً ان کی نثر کسی طرح سے پیچھے نہیں ہے۔

سید حامد مولانا آزاد اور مولانا جوہر کی نثر کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ابوالکلام کی بلند پروازی کے مقابلے میں جوہر کے یہاں پیادہ روی ہے۔ وہاں ادب عالیہ اور اختراعات فائقہ، یہاں صرف یہ جاں سوز فکر کہ ایک قوم کی قوم کو، ایک جاہل پس ماندہ قوم کو اپنا مفہوم کس طرح ذہن نشین کرایا جائے، لیکن محمد علی کا انگریزی پر اہل زبان کا سا عبور وہ اضافی وصف ہے جو ابوالکلام کو میسر نہ تھا۔ علاوہ بریں محمد علی کی نثر (اُردو) زبان اور محاورہ کی اُن غلطیوں سے محفوظ ہے جو رُخِ زیبا پر تل کی طرح ابوالکلام کے یہاں مل جاتی ہے''۔ (نظر برنی، مولانا محمد علی شخصیت اور خدمات نئی دہلی، ص۱۹۲)

مولانا محمد علی جوہر اور مولانا آزاد جنگ آزادی میں دونوں ہم سفر تھے۔ حصول آزادی میں دونوں کا ساتھ تقریباً ۱۵ سال رہا۔ دونوں میں بہت ساری مماثلتیں اور مشابہتیں پائی جاتی ہے۔۔ دونوں بے باک اور اعلیٰ درجے کے صحافی تھے۔ دونوں شاعر اور نثر نگار۔ دونوں سچے اور پکے مسلمان اور مذہبی عبادات کے پابند تھے۔ ۱۵ سال کے عرصہ میں صحافت، سیاست اور ملکی و مسلکی مسائل کے تیئں دونوں کے درمیان رفاقت اور رقابت رہی۔ پھر بھی دونوں ایک دوسرے کا بے حد احترام کرتے تھے اور اختلافات رائے کا اظہار بھی برملا کرتے تھے۔ مولانا آزاد کا اسلوب اشارے اور کنایے کی زبان میں ہوتا، لیکن مولانا محمد علی کا اظہار برملا جوشیلے انداز میں ہوتا، اور انداز تخاطب بالکل راست ہوتا۔ دونوں میں رقابت کی وجہ ذاتی رائے نہیں بلکہ قوم و ملت کی فلاح و بہبودی تھی۔ مولانا محمد علی اور مولانا آزاد بعض مسائل میں ایک دوسرے سے متفق نہیں تھے۔ مولانا آزاد نے اپنے

اخبار ''الہلال'' میں مولانا محمد علی کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:

''مسٹر محمد علی سے ہمارے تعلقات اب صرف دوستانہ ہی نہیں، ایسے قریب کہ عزیزانہ ہیں کہ ان کی نسبت رائے قائم کرنے کا پورا موقع رکھتے ہیں۔ ہم نے اچھی طرح اندازہ کرلیا کہ ان کے دل میں آزادی اور جوش، دونوں چیزیں موجود ہیں''۔ (ضیاءالحسن فاروقی ماہنامہ جامعہ اپریل ۱۹۷۹ء ص ۱۰۲)

مولانا محمد علی کی انگریزی انشا پردازی اور قوت تحریر کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں:

''یہی مسٹر محمد علی ہیں جو اِن تمام تعلیمات و ہدایات عالیہ کے مرکز جمود (علی گڑھ کالج) کے تعلیم یافتہ اور ایک ایسی ریاست کے عہدہ دار تھے۔ چند مضامین اور ایک رسالہ لکھ کر اُنھوں نے اپنی قابلیت ضرور منوائی تھی۔ لیکن کوئی بھی ان کی موجودہ حیثیت ملی سے واقف نہ تھا لیکن جب زمانے نے مہلت دی اور قوتوں کو چمکنے کے اسباب میسر آئے تو آج کوئی نہیں جو ان کی انگریزی انشا پردازی اور قوت تحریر و بحث کا معترف نہ ہو''۔ (ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جوہر نمبر ۱۹۸۶ء ص ۱۰۲)

مولانا محمد علی جوہر گرچہ کہ عمر میں مولانا آزاد سے بڑے تھے پھر بھی وہ انھیں اپنا استاد مانتے تھے، لیکن جب ان دو عظیم شخصیتوں کے درمیان اختلاف ہوا تو ہر ایک نے کھل کر اس کا اظہار کیا لیکن وہی شائستہ اور سلجھے ہوئے انداز میں، کہیں اُنھوں نے ذاتیات کو موضوع بحث بننے نہیں دیا۔ دونوں کی تحریریں پُر وقار، سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ساتھ ادبی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

مولانا آزاد کا الہلال جب منظر عام پر آیا تو مسلم یونیورسٹی کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ چنانچہ اول روز ہی سے اس تحریک سے متعلق لکھنا شروع کر دیا تھا۔ یکم ستمبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں مولانا آزاد ''مسلم یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھ کر مولانا محمد علی سے چند اُمور کی وضاحت چاہی تھی۔ الہلال کی اس اشاعت میں مولانا آزاد کے اس مضمون کی دوسری اور آخری قسط بھی چھپی تھی جس کا عنوان تھا ''نشہ شام کی نصف شب''۔

مولانا آزاد ''مسلم یونیورسٹی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

ہم کو معلوم ہے کہ ہمارے دوست وہی محمد علی ہیں جنھوں نے نواب محسن الملک مرحوم کے زمانے میں اپنے کالج سے نئے نئے خطابات حاصل کئے تھے اور پھر یہ وہی محمد علی ہیں جنھوں نے ہمیشہ کالج کی زر پرستی کی مخالفت کی اور ٹرسٹیوں کی دائمی حکمرانی کے مسئلے کو بار بار چھیڑا۔ وہ گو ہمیشہ علی گڑھ میں رہے مگر ہم نے تو ہمیشہ ان کو اس کے باہر ہی دیکھا ہے اور اب تو میلوں دور دیکھتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے جب چاہا تھا کہ آذر کے بتکدے کو توڑے تو خود اسی کے گھر میں خلیل بت شکن کو پیدا کر دیا تھا۔ ہم کو یقین ہے کہ مسٹر محمد علی بھی علی گڑھ سے اس لئے اُٹھائے گئے ہیں تا کہ اپنے گھر کی دیواروں سے بت پرستی کے نقوش مٹا دیں......

یونیورسٹی کمیٹی کے متعلق عام طور پر موجودہ حالات نے بے اعتمادی اور شکوک پیدا کر دیئے ہیں۔ کیا اچھا ہو اگر وہ حق گوئی اور بے لاگ سچائی کی قدر و قیمت کو پیش نظر رکھ کے مندرجہ ذیل اُمور پر اپنی معلومات ظاہر کر دیں۔ وہ ابتداء سے شریکِ کار رہے ہیں اور ہم کو شکوک اور سوءِ ظن سے نجات دے سکتے ہیں''۔ (ضیاء الحسن فاروقی ماہنامہ جامعہ اپریل ۱۹۷۹ء ص ۱۰۳)

مولانا محمد علی کب خاموش رہنے والے تھے۔ الہلال کے دونوں مضامین کا جواب دیتے ہوئے اپنا ایک مکتوب شائع کرایا جس کے چند ٹکڑے درج ذیل ہیں:

''مانا کہ الہلال افقِ عالم پر اس وقت نمودار نہ ہوا تھا مگر آزادی کے بدر کامل کو یہ کیسا گہن لگا تھا کہ آج کامل ایک سال بعد ظلمتِ علی گڑھ پر نور ایمان غالب آیا ہے''۔

''آنجناب نے صرف سرہارکورٹ بٹلر کی ۹/اگست ۱۹۱۲ء کی تحریر کا ترجمہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں پڑھا اور اس میں جو فقرہ ۳۱/جولائی ۱۹۱۱ء سے ماخوذ تھا اس کی غلط تاویل فرما کر بلا غور و فکر اور بے تامل پچاس ساٹھ مسلمانوں کو کاذب اور فریبی ٹھہرا دیا اور (آگے آیت) کلام الٰہی سے اپنے فتوے کی تصدیق بھی حسب معمول فرما دی، شاید ظن مومن کی یہی تعریف ہو۔ مگر یہ مسائل مذہبی ہیں اور میں محض سگِ دنیا، البتہ اتنا ضرور عرض کروں گا کہ یہ طریقۂ اخبار نویسی خواہ لکھنے والے کے لئے کتنا ہی دل خوش کن اور عوام کے لئے کیسا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، جن پر سب و شتم کی بوچھار پڑتی ہے ان کے لئے ضرور بہت کچھ دل شکن ہے''۔ (ضیاء الحسن فاروقی ماہنامہ جامعہ اپریل ۱۹۷۹ء ص ۱۰۳)

مولانا آزاد نے بھی جوابی وار کیا، لکھتے ہیں:

''آپ نے ''آزادی کا بدرِ کامل'' اگر محض ''ہلال'' کے لئے لکھا ہے تو اس زورِ عبارت سے خود بھی مزہ لیتا ہوں، لیکن اگر طنزاً ہے تو مزاح سے الگ ہو کر مجھے کہنے دیجئے کہ آزادی اور آزاد بیانی کے درجہ کو تو اپنی بساط سے بہت بلند سمجھتا ہوں۔ اس منزل تک پہنچنے کے لئے جن قربانیوں اور خود فروشیوں کی ضرورت ہے وہ ہر کس و ناکس کو نصیب نہیں ہو سکتیں۔ میرے دل میں تو ایک لمحہ کے لئے بھی اس دعوے کا خطرہ نہیں گذرا مگر میری محرومی سے آزادی کی آواز دنیا سے معدوم نہیں ہو سکتی۔ اس کو مجھ میں نہ ڈھونڈیئے۔

البتہ اس کی آواز اُٹھے تو کانوں کو بند بھی نہ کیجئے۔

منکر نتواں گشت اگر دم زغم از عشق

ایں نشہ بمن گر نبود بادِگرے ہست (ایضا ۱۰۳، ۱۰۴)

محمد علی جوہر بھی وار کرنے سے کب چوکتے، اس کا بھی جواب دیا۔ لیکن وہی شائستہ اور شگفتہ انداز میں:

''آپ متعجب ہیں کہ ''ظن المومنین خیرا'' کی کیا یہی تعریف ہے کہ کمیٹی کو ایسے سخت الزام دیئے جائیں؟ لیکن آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ آخر حسن ظن کی کوئی حد بھی تو ہونی چاہئے۔ برسوں مسلمانوں نے اپنے لیڈروں کے ساتھ حسنِ ظن سے کام لیا لیکن اس حسن ظن کا جو نتیجہ نکلا وہ آپ کے دل میں اور میری زبان پر ہے۔ اب تو کچھ دنوں سوء ظن ہی سے کام لینے دیجئے۔ آپ نے ''سگِ دنیا'' کے لقب کی ٹوپی خود ہی اپنے سر اوڑھ لی۔ حالانکہ جن سروں کے لئے قطع کی گئی تھی ان کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں گو آپ اس طرف اشارہ نہ کریں۔ حیران ہو کہ آپ کو کسی خیال میں اپنے سے مختلف نہیں پاتا، لیکن پھر دیکھتا ہوں تو بہت دور ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ جام تو آپ کے ہاتھ میں بھی ہے مگر ''فسق'' کے الزام کے لئے میرا ہی وجود موزوں ہے:

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نام فسق'' (۱۰۴)

اس کے بعد مولانا آزاد نے فروری اور مارچ ۱۹۱۳ء کی الہلال کی اشاعتوں میں ''حدیث الغاشیہ'' کے عنوان سے اور ''نشۂ نیم شبی کا صبح خمار'' کے تحتی عنوان کے تحت مولانا محمد علی کے انقلابِ حال پر پھبتیاں کسی ہیں۔ گرچہ کہ وہ بادہ و ساغر کی زبان میں ہیں کہیں کہیں صاف نام بھی لیا ہے۔ مولانا محمد علی نے بھی اس کا جواب دیا۔ وہی طرز اپنایا جو مولانا آزاد نے اختیار کیا تھا۔ لیکن دونوں کا انداز بیان شائستہ اور سلجھا ہوا نظر آتا ہے۔

مولانا محمد علی نے مولانا آزاد اور علامہ اقبال کو اپنا مذہبی استاد تسلیم کیا ہے۔ مولانا کی ذہانت اور ذکاوت کی خوب تعریف کرتے ہیں اور ان کو ایک اچھے مقرر بھی مانتے ہیں۔ ایک جگہ ہمدرد میں لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام سے میری رقابت کی حقیقت یہ ہے کہ میں ہر جگہ اس کی شہادت دینے کو تیار ہوں کہ مولانا کی ذکاوت و ذہانت مجھ سے کہیں زیادہ ہے''۔ (ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، جوہر نمبر ۱۹۸۶ء ص ۲۰۵)

ان دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے پر جو اعتراض کئے ہیں اس میں کہیں بھی ذاتیات کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہے۔ صرف قوم و ملک کا مفاد عزیز تھا۔ اختلافی نظریات کے پیچھے کبھی بھی اپنی انا کو دخیل ہونے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں مولانا جوہر آزادیٔ کامل کا مطالبہ کرتے ہوئے دیارِ غیر میں اپنی جان قربان کردی۔ اور مولانا آزاد تقسیم کا تلخ گھونٹ پی کر بھی ہندوستان ہی میں اپنی ناقابل فراموش خدمات سے مسلمانوں کے لیے ہمیشہ کے لیے وقار اور تمکنت کا باعث بنے۔ اور سیاست، صحافت اور ادب میں ایسے نقوش چھوڑے کہ آنے والی نسل ہمیشہ اس سے مستفیض ہوتی رہے گی۔

اردو میں مہجری ادب

مہجری ادب سیمینار کے مقالات کا مجموعہ

مرتبین

ڈاکٹر محمد نثار احمد

ڈاکٹر [illegible] اللہ بختیاری

آندھرا پردیش اسٹیٹ اردو اکیڈمی

ఆంధ్రప్రదేశ్ రాష్ట్ర ఉర్దూ అకాడమి

A.P STATE URDU ACADEMY

آندھرا پردیش اسٹیٹ اردو اکیڈمی، وجئے واڑہ

فہرست

۱	پیغام	ڈاکٹر ایس محمد نعمان	4
۲	عرضِ ناشر	ڈاکٹر محمد نثار احمد	6
۳	عرضِ مرتب	ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری	7
۴	مقدمہ	پروفیسر مظفر علی شہہ میری	10
۵	اردو میں مہجری ادب: سخن گسترانہ بات	ڈاکٹر سید اقبال خسر قادری	18
۶	اردو میں مہجری ادب-تعارف، ماہیت اور امکانات	ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری	22
۷	مہجری ادب-ایک مختصر تعارف	سید شکیل احمد شکیل	31
۸	مہجری ادب کا سرسری جائزہ	ڈاکٹر سید سلطان معین الدین حسینی	34
۹	ہجرت کا کرب اور رؤف خلش	پروفیسر سید فضل اللہ مکرم	39
۱۰	سعید نظر کے کلام میں مہجری ادب کی جھلکیاں	ڈاکٹر محمد نثار احمد	49
۱۱	اعتماد صدیقی: ہجرتوں کے کرب کا جدید شاعر	سید معظم راز	56
۱۲	ڈاکٹر حنیف ترین کی شاعری میں مہجری کرب	ڈاکٹر شیخ فاروق باشا عمری	65
۱۳	افتخار عارف کی شاعری میں مہاجرت کے عناصر	ڈاکٹر سید فتح اللہ بختیاری	70
۱۴	افتخار راغب کی غزلوں میں ہجرت کا کرب	محمد فیض اللہ	75
۱۵	ادبِ مہجر کا درخشندہ ستارہ: رضاء الجبار	ڈاکٹر شیخ نجات اللہ شریف	81
۱۶	مہجری ادب، برطانیہ اور حبیب حیدر آبادی	ڈاکٹر محمد عبد العزیز سہیل	88
۱۷	کربِ مہاجرت اور منور رانا کا مہاجر نامہ	ظہیر دانش عمری	97
۱۸	عرصۂ خیال کا مہجری شاعر: اسلم عمادی	محمد نقی اللہ خان	106
۱۹	رپورتاژ	سید معظم راز	115

ڈاکٹر شیخ فاروق باشا عمری

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو،

گورنمنٹ ڈگری کالج' رائے چوٹی' ضلع کڈپہ

ڈاکٹر حنیف ترین کی شاعری میں مہجری کرب

ڈاکٹر حنیف ترین کی ولادت یکم اکتوبر ۱۹۵۱ء کو سنبھل ضلع مرادآباد میں ہوئی۔علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔سری نگر میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی سند حاصل کی۔ پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔ڈی کیا۔پھر چند ماہ ہاؤس جاب کرنے کے بعد تلاش معاش کے سلسلہ میں سعودی عرب چلے گئے جہاں 1982 تا 2004 ان کا قیام رہا۔پیشہ طب سے وابستہ ہونے کے باوجوداُردو زبان وادب سے غیر معمولی لگاؤ اور شغف تھا۔اس کی اہم وجہ گھر کا ماحول اورمشاہیر شعراء کی صحبت ہے۔کالج کی تعلیم کے دوران ایک غزل انہوں نے سنائی جو بہت مشہور ہوئی اورخوب دادی ملی جس سے ان کا شعری مذاق پروان چڑھا۔

انسان جب ایک مقام سے دوسرے مقام کو ہجرت کرتا ہے تو اپنے ساتھ ساز وسامان اورزادراہ کے ساتھ اپنی زبان،تہذیب، کلچر اور تمدن کو بھی ساتھ لے کر چلتا ہے۔اپنی یادوں کے حسین گلدستوں کو بھی ہمیشہ معطر رکھتا ہے۔ہجرت کا عمل ادیب کے لئے ذہنی کرب کا سامان ہوسکتا ہے لیکن ادب کے لئے ہجرت فال نیک ثابت ہوئی۔ادب میں نئے موضوعات ،نئی بستیاں، نئے مسائل،نئی تہذیبیں، رجائیت اور قنوطیت، سیاسی اقتصادی اور ثقافتی حالات وطن کی یاد،وطن سے محبت کے جذبات،ہجر کا کرب،وصل کی تمنا جیسے مسائل نے اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا۔ڈاکٹر اشفاق احمد مہجری ادب کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"مہجری ادب ایک ایسا ادب ہے جس کی ایک ایک سطر سے خوشبوئے وطن پھوٹتی

ہے، وفا پرستی کے نغمے گونجتے ہیں' فدائیت اور جاں نثاری کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جس کا ہر فنکار اپنے میدان تخیل کا شہ سوار' جس کی ہر تحریر دل پذیر' جس کا ہر اسلوب قاری کے لئے پسندیدہ اور مقبول ہے''۔

ڈاکٹر حنیف ترین کی ہجرت تلاش معاش کے سبب ہوئی۔ بائیس سالہ قیام سعودی عرب کے دوران اُن کا شعری سفر روز افزوں ترقی کرتا گیا۔ اس دوران آپ کے کئی ایک شعری مجموعے منظر نامے پر آئے جن میں رباب صحرا (1992)' کتاب صحرا (جنوری 1995)' کشت غزل نما (جنوری 1999)' زمین لاپتہ رہی (2001)' ابابیلیں نہیں آئیں (2004) شامل ہیں۔

ان شعری مجموعوں میں نظم، غزل، قطعات، ترائیلے، دوہے، ہائیکو جیسی اصناف شاعری شامل ہیں۔

حنیف بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ نظم سے ان کو خاص انسیت ہے۔ نظم کا کینوس وسیع ہوتا ہے۔ ایجاز واطناب کے دونوں پیرائے نظم کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ ان کی نظموں میں ایک طرف زمین وآسمان کے رنگ، مرادآباد کے کھیت کھلیان، گلیاں، محلے، پیڑ پودے، ندی، تالاب، کنواں اور وہاں کی بے فکری زندگی کا اظہار بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ دوسری طرف سعودی عرب کے مخصوص صحرا اور تپتی ریت کے مسائل کے ہیں۔

ڈاکٹر حنیف کی ہجرت نہ دین وایمان کی سلامتی کے لئے' نہ دشمنوں کے ظلم وجبر کا نتیجہ' اور نہ مستقل انہوں نے نقل مکانی کی بلکہ خالص تلاش معاش کے لئے تھی۔ اور یہ امر واضح طلب ہے کہ اگر کوئی شاعر مستقل یا غیر مستقل تلاش معاش کے سلسلہ میں وطن سے دور رہ کر حب الوطنی اور غریب الوطنی کے جذبات پیش کرتا ہے تو وہ مہجری ادب کہلائے گا یا نہیں؟ مہجری ادب کے لئے مستقل ہجرت ضروری ہے یا نہیں؟ یا کسی کا مصیبت یا جان ومال کی امان پانے کے لئے بے حد مجبوری کی حالت میں ہجرت کرنا اور دیار غیر میں رہ کر اپنے وطن عزیز کے لئے تڑپنا اور فراق

کے کرب کو پیش کرنا ہی مہجری ادب کا حصہ ہے؟

مہجری ادب میں تلاش معاش یا غیر مستقل ہجرت کے دوران جو ترک وطن کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ذہنی کرب کو شامل کریں تو اس راہ میں حنیف ترین بھی شامل ہیں۔

بہر حال ڈاکٹر حنیف فارغ البال اور مرفحہ الحال سرجن تھے۔ دولت، شہرت اور عزت سے وہ مالا مال تھے۔ اس کے باوجود وطن عزیز کی اس خوشبو کو جو دل و دماغ اور روح کو معطر کر چکی تھی کبھی اس سے غافل نہ رہے۔ خوش حالی کتنی ہی زندگی کو مزین کر دے ایک انسان اپنے ماضی کے اس گاؤں کو کبھی بھول نہیں سکتا جہاں اس کی ابتدائی زندگی کا حصہ گزرا ہو۔ حنیف ترین کی شاعری میں غریب الوطنی، حب الوطنی، ہجرت اور نقل مکانی کے کرب کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ایک نظم ''ایک خیال آتا ہے'' میں کہتے ہیں:

گھر سے دوریوں کا غم / آنسوؤں کے صحرا میں / پھول سے کھلاتا ہے /
میری پیاری بیٹی ہے / راگنی ہے الفت کی /
جو گلوں کے ہونٹوں پر / خوشنما کہانی ہے/

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

آج کی اِن سہولتوں کے بیچ / میں ہوں دن رات کی مشقت میں (لالہ صحرائی ۲۱)

وادئ کشمیر سے حنیف کو خاص لگاؤ اور محبت ہے کیونکہ طب کی تعلیم یہیں سے انہوں نے حاصل کی۔ اور اپنی شریک حیات سے یہیں آنکھیں چار ہوئیں تھیں۔ ایک نظم میں کہتے ہیں:

وادئ کشمیر جب سے جسم و جاں بنی
مجھ کو صحرائی تپش میں بھی بڑا آرام ہے
دل کے کتبے پر مرے، نقش ترا نام ہے

نگاہ وادیٔ کشمیر تجھ سے کیا بتاؤں میں
یہاں رہ کر تو لگتا ہے کہ اپنا گھر بھی زنداں ہے

ڈاکٹر حنیف نے اپنی تخلیقات اور شاعری میں جس ذہنی کرب اور روحانی اذیت کا احساس دلایا ہے اور اس کے اظہار کے لئے جو تجربات پیش کئے ہیں وہ شعری اسلوب میں ایک اہم اضافہ ہے۔بقول قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی ان کی بہترین غزلیں وہی ہیں جو تخلیقی اضطراب اور سوزِ دروں کی کیفیات سے سرشار ہیں۔اور خود بھی اشکوں میں ہیں:

ہر زخم کہنہ وقت کے مرہم نے بھر دیا
وہ درد بھی مٹا جو خوشی کی اساس تھا

حنیف ترین کی شاعری میں زندگی کے بے شمار مسائل موجود ہیں۔دیارِ غیر میں ان کا دل ہمیشہ آشنا چہروں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔دھنک کے خوشگوار احساسات اور مشاہدات سے تسکین پاتا ہے۔جگ کے کرب،خلوت اور جلوت کے کرب سے وہ اندر سے ٹوٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔بقول وزیر آغا کہ:

''وہ دو صحراؤں کے درمیان کہیں رہ رہے ہیں۔ایک طرف ریت کا صحرا ہے اور دوسری طرف پانی کا صحرا ہے۔اور یہ دونوں صحراؤں کی ذات کے اندر اتر کر ایک ایسا تیسرا صحرا بن گئے ہیں جس کے قدم پانی اور دھڑ ریت میں ہے''۔غزل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

اشک شعلہ نے، تیلیاں جل گئیں
ساعتیں جب غم ہجر میں ڈھل گئیں

(غزل نما۲۴)

تلاش معاش میں دیارِ غیر کا سفر کرتے ہوئے وہ زندگی کے نئے نئے تجربات اور مشاہدات سے آشنا ہوتے ہیں۔رنگ تغزل کے یہ اشعار دل شکستگی اور ہجر و وصال کی صدا بن جاتے ہیں:

شور جب سو گیا جاگی وحشت
پھیلا یادوں کا دھواں گلیوں میں
پلکوں پہ نارسائی کی کچھ بدلیاں حنیفؔ
ناسور بن کے دل کی زمین پر برس گئیں
خزاں میں اوڑھ کے قول و قرار کا موسم
بہار ڈھونڈ رہی ہے بہار کا موسم

عام طور پر یہ دیارِ غیر میں ناموافق مشاہدات اور تجربات دیکھ کر مہاجرین کو خاموشی کا زہر پینا پڑتا ہے لیکن ڈاکٹر حنیف قیام سعودی عرب کے دوران ناپسندیدہ چیزوں کو دیکھ کر دبے الفاظ میں یہ صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ دھوپ، ریت، دشت، برف جیسے الفاظ کو نئی معنویت عطا کرتے ہیں:

اُٹھیں گی ریت سے جب بھی جنوں کی آوازیں
تو دشت بیڑیاں اپنی بجا رہا ہوگا
برفاب ہو چکے جو بکھرنے کے خوف سے
ان موسموں کو دھوپ کی یلغار چاہیے
فنا کے خوف سے احساس سرد ہیں جن کے
انہیں کڑی کڑی دھوپ کی سزا دینا

غرض ڈاکٹر حنیف ترین نے مہجری فکر کو اس طرح اپنی شاعری میں پیش کیا ہے کہ وہ تمام تارکین وطن جو اپنے گھروں سے دور دیارِ غیر میں رہتے ہیں، اپنے دلوں کی دھڑکنیں ان کی شاعری میں محسوس کر سکتے ہیں۔

رطب و یابس

مضامین و مقالات کا مجموعہ

ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری

تفصیلات

نامِ کتاب : رطب ویابس

مرتب : ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری

اشاعت : دسمبر 2016ء

صفحات : 120

کمپیوزنگ : ڈاکٹر وصی بختیاری عمری/ارشاد سہیل عمری

قیمت : 150/روپے

مطبع : سہیل گرافکس، حیدرآباد

ناشر : شعبۂ اردو، سی.عبدالحکیم کالج (خودمختار)، میل وشارم

یہ کتاب اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جزوی مالی اعانت سے شائع کی گئی ہے۔

RATB-O-YABIS

(Collection of Papers)

by

Dr. Syed Vasiulla Bakhtiary

Assistant Professor, Department of Urdu

Govt. Degree College, RAYACHOTY- 516269

vasibakhtiary@gmail.com

Mob: +91 9441905026

December, 2016

ISBN : 978-81-927802-8-38

Published By

DEPARTMENT OF URDU

C. ABDUL HAKEEM COLLEGE (AUTONOMOUS)

MELVISHARAM - 632509

Vellore District, Tamil Nadu

E-mail: prof.yassir@gmail.com

فہرست

حرفِ چند 3

مقدمہ 7

نقوشِ اقبال اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ 11

لسان العصر اکبرالہ آبادی کی ایک نظم 20

شاعر جذب وہوش حضرت مجذوبؔ 26

مولانا عبدالسلام ندوی بحیثیت نقاد 34

مولانا سید نجیب اشرف ندوی - ادیب ومؤرخ 43

مولانا سید حسن مثنی ندوی - ایک ادبی سراغ رساں 46

مولانا ثناءاللہ عمری کی مرقع نگاری 51

مہکتے پھول - زہرہ بتولؓ کی شعری کائنات 64

منٹو تنقید - ایک جائزہ 74

دکنی حکایات کی لسانیات - ایک جائزہ 81

قومی یکجہتی کے فروغ میں تراجم کا کردار ** 91

دبستانِ کڈپہ - شناخت اور امکانات 96

سید سجاد بخاری - شخصیت اور ادبی خدمات 104

اصنماد اور صاحبِ اصفاد 111

مقدمہ

ڈاکٹر شیخ فاروق باشا عمری
شعبۂ اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، رائے چوٹی

ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری عمری، دکن کی مایہ ناز ادبی شخصیت ہیں۔ خوش فکر شاعر، بلند پایہ نثر نگار، معتبر نقاد، مبصر و مفکر، تجزیہ نگار، سب سے بڑھ کر اردو زبان کے معلم و مدرس اور ہمدرد و مشفق استاد ہیں۔ آپ کی مادری زبان اردو ہے، لیکن عربی و فارسی پر بھی قدرت حاصل ہے۔ موصوف کی تحریروں میں تینوں زبانوں کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔

موصوف سے میرے تعلقات گذشتہ تیس برس سے شجرِ مثمرہ کی طرح شاداب و آباد ہیں۔ رائے چوٹی کے گورنمنٹ کالج میں شعبۂ اردو میں ہم دونوں رفیق ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ کی تحریروں پر تبصرہ یا تجزیہ مجھے علمی کم مائیگی کے احساس کے ساتھ ہی فخر و انبساط کا موقعہ بھی ہے کہ ایسی شخصیت پر کچھ لکھنے کا سنہرا موقعہ نصیب ہوا کہ جن کے ادبی تعلقات کا دائرہ ہند و پاک کی سرزمین سے متجاوز ہو کر عالمی اردو زبان کے مشاہیرِ ادب سے ہے۔ اردو زبان کی مایہ ناز ہستیاں آپ سے ہمکلام ہوتی ہیں، آپ کی تعلیمی صلاحیتوں اور ادبی لیاقتوں کو تسلیم کرتی ہیں۔

ڈاکٹر وصیؔ بختیاری عمری، شیریں مقال، خوش گفتار، خوش اخلاق، پیکرِ علم و عمل، باادب و باصفا، ایک ہی ملاقات سے دل کی گہرائیوں میں اتر جانے کی تاثیر رکھتے ہیں۔ نازک خیال،

لطیف ادراک واحساس کے شاعر جن کو پڑھ کر شدید دھوپ کے مسافر کو نیم کے گھنے سایے کی ٹھنڈک کا احساس ہو اور بھٹکے ہوئے صحرائی مسافر کو نشانِ منزل کا پتہ مل گیا ہو۔ تقریر وتحریر پر ایسی یکساں قدرت کہ جیسے آفتاب کی تمازت سے پھلوں میں رنگت اور ماہتاب کی چاندنی سے پھولوں میں مہک ہو۔

زیرِ نظر مجموعۂ مقالات آپ کے نثری کاوشوں پر مشتمل ہے۔ جنہیں آپ نے مختلف قومی وبین الاقوامی سمیناروں اور کانفرنسوں میں مشاہیرِ ادب کے سامنے پیش کر کے خراجِ تحسین پایا ہے۔ موصوف نے جن ہستیوں پر قلم اٹھایا ہے، وہ خود اپنے دور کے اکابرینِ ادب میں شامل ہیں۔

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ممتاز عالمِ دین ہونے کے ساتھ ایک ادیب اور نقاد بھی تھے۔ آپ کی کتاب ''نقوشِ اقبال'' اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافہ تسلیم کی جاتی ہے۔ اس میں آپ نے فکرِ اقبال کا ایک متوازن اور معتدل تجزیہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر وصی بختیاری نے اس کتاب پر مختلف آراء جمع کر کے اس کتاب کی ادبی وقعت کو پیش کیا ہے۔

لسان العصر اکبر الہ آبادی کی ایک نظم جس کا پہلا شعر ہے:

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملکِ عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

اس نظم کی روشنی میں انہوں نے اکبر کے کلام کا تجزیہ اور ان کی فکر کا جائزہ پیش کیا ہے۔

شاعرِ جذب وہوش کے نام سے مشہور صوفی شاعر خواجہ عزیز الحسن مجذوبؔ کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی ایک معتبر مؤرخ اور مستند محقق ہیں۔ ڈاکٹر وصی بختیاری نے اس مضمون میں ان کے تنقیدی مضامین کا بحسن وخوبی جائزہ لیا ہے۔ تنقید کے موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے بڑی عرق ریزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن انہوں نے باریک بینی سے حقیقت پسندانہ

تبصرہ کرتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی کو ایک غیر جانب دار، حق گو اور صداقت سے بھرپور تنقید نگار تسلیم کیا ہے۔

مولانا سید نجیب اشرف ندوی اور مولانا حسن مثنیٰ ندوی پر مضامین، علمی اور تعارفی ہیں، جن کے مطالعہ سے ان کی علمی و ادبی خدمات کا پتا چلتا ہے۔ مؤخرالذکر کی ادبی سراغ رسانی اور سرکاری فائلوں کی چوری کافی دلچسپ اور معلوماتی دستاویز ہیں۔

فرزندِ جامعہ عثمانیہ مولانا ثناء اللہ عمری بلند پایہ نثر نگار ہیں۔ مولانا کے کئی ایک ادبی میدان ہیں۔ لیکن اس مضمون میں ان کی مرقع نگاری کی خوبیوں اور محاسن کا کامیابی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مضمون کی انفرادیت یہ ہے کہ اب تک کسی نے مولانا کی اس کاوش پر نظر التفات نہیں کیا۔

زہرہ بتولؒ، استاذ الاساتذہ کہنہ مشق شاعر مولانا ابولبیان حمّاد عمری کی زوجہ محترمہ ہیں، جن کا چند سال پیشتر انتقال ہوا۔ اس مضمون میں محترمہ کی شعری محاسن کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کیا گیا ہے۔

سعادت حسن منٹو کو بحیثیت افسانہ نگار ہر اردو داں بخوبی جانتا ہے۔ منٹو نے اردو افسانہ نگاری کو عالمی سطح کے افسانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ منٹو پر بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن موصوف کا کہنا درست ہے کہ صحیح معنوں میں منٹو کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا۔ منٹو پر ابھی بھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔ جس کی طرف تنقید نگاروں کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

دکنی حکایات کی لسانیات - ایک جائزہ، اس مقالہ پر تحقیقی رنگ غالب ہے۔ اس میں مقالہ نگار نے کئی مخطوطات کے حوالوں سے قدیم اردو کے لسانی عناصر کو ابھارا ہے۔ اس مقالہ کو ڈاکٹر وصی بختیاری صاحب نے ''اردو کا حکائی ادب - ایک تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے منعقدہ میل وشارم سمینار میں پیش کیا۔

قومی یکجہتی کے فروغ میں تراجم کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ قومی یکجہتی کے لیے

تراجم کی بہت اہمیت پر ایک مقالہ ڈاکٹر وصی بختیاری نے برادر ڈاکٹر ایس محمد یاسر کے ساتھ مشترک طور پر لکھا تھا۔ اسے بھی اس مجموعۂ رطب ویابس میں شامل کیا جارہا ہے۔

''دبستانِ کڈپہ- شناخت اور امکانات'' یہ ایک قدیم مقالہ ہے جس میں دبستانِ کڈپہ کا ادبی منظرنامہ بڑے شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس مقالہ کی ادبی افادیت کے پیشِ نظر میرے بے حد اصرار پر اس مقالہ کو اسی مجموعۂ مقالات میں شامل کیا گیا ہے جس کے لیے میں موصوف کا شکرگذار ہوں۔

''اصفا اور صاحبِ اصفاد'' شہر رائے چوٹی کے ایک باوقار شاعر امام قاسم ساقؔی کے شعری مجموعہ ''اصفاد'' پر تبصرہ ہے۔ اس مختصر تحریر میں صاحبِ اصفاد کی شعری خوبیوں اور شخصیت کی جھلکیوں کو پیش کرنے اور ان کے ادبی مذاق کو جلا بخشنے کی سعی کی ہے۔

ڈاکٹر وصی بختیاری صاحب، صاحبِ طرز ادیب اور نثر نگار ہیں۔ خود شاعر ہونے کی وجہ سے شعری محاسن ومعائب کو باریک بینی سے پرکھنے کا ملکہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح آپ کی نثر بھی لفظیات کے پیکر میں ڈھل کر بارش کے قطرات کی طرح پاک وصاف نظر آتی ہے۔ مترادفات کی گھن گرج سے دل ودماغ معطر ہوجاتے ہیں۔ قاری کو کسی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ اسلوبِ بیان شگفتہ اور شائستہ، طرزِ نگارش عمدہ واعلیٰ، لفظیات سمندری تموّج کی طرح، یکے بعد دیگرے صف بستہ نظر آتے ہیں۔ اس قسم کی عمدہ نثر کی بہترین مثالیں، اس مجموعۂ مقالات میں ہمیں جابجا نظر آتے ہیں۔

ع   اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ!

اللہ تعالیٰ موصوف سے اسی طرح علمی خدمات لیتا رہے اور متلاشیانِ علم وادب کو سیراب کرتا رہے۔ آمین۔

A Research & Refereed Jounal (ISSN-2249-7854)

اردو جرنل ۱۲

۲۰۲۱

شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی کا اکیڈمک ریسرچ اینڈ ریفریڈ جرنل

گوشے

اکبر الہ آبادی — ساحر لدھیانوی

مدیر

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

''اکبرالہ آبادی کی غزل گوئی'' پر توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر علی احمد فاطمی
ڈائس پر موجود ہیں ڈاکٹر عبدالصمد، پروفیسر اعجاز علی ارشد، امتیاز احمد کریمی اور صفدر امام قادری وغیرہ

اردو صحافت کی دوصد سالہ تقریب میں مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، ڈائس پر موجود ہیں
پروفیسر جاوید حیات، کرنل [illegible] سید مظفر حسین، ڈاکٹر اسرائیل رضا، ڈاکٹر ریحان غنی اور احمد جاوید وغیرہ

شعبۂ اردو سے شائع ہونے والے سہ ماہی ''خبر نامہ'' کے دوسرے شمارے کا اجرا کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالصمد،
پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر رگھونندن شرما، پروفیسر علی احمد فاطمی، امتیاز احمد کریمی اور صفدر امام قادری

اردو جرنل ۱۲

2021

(ISSN: 2249-7854)

سرپرست

پروفیسر گریش کمار چودھری

وائس چانسلر، پٹنہ یونیورسٹی

مدیر

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

صدر شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

پیش کش

شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۵

© جملہ حقوق بحق شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی محفوظ

نام مجلّہ	:	اردو جرنل (ISSN:2249-7854)
اشاعت	:	۲۰۲۱ء
کتابی سلسلہ	:	۱۲
ناشر	:	شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۵
صفحات	:	352
اس شمارے کی قیمت	:	300 روپے (تین سو روپے)
اعزازی تعاون	:	-/1000 (چار سال) -/2000 (سات سال) -/5000 (تاحیات)
کمپوزنگ	:	شاہد وصی، رابطہ 9006331029
ملنے کا پتہ	:	شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔ ۸۰۰۰۰۵
مطبع	:	مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی 9811794822

مجلس ادارت (Peer Review Committee)

پروفیسر اعجاز علی ارشد

پروفیسر جاوید حیات	پروفیسر اسلم آزاد
پروفیسر اسرائیل رضا	پروفیسر قدوس جاوید
پروفیسر علیم اللہ حالی	پروفیسر حسین الحق
پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین	پروفیسر کوثر مظہری

مجلس مشاورت

ڈاکٹر سورج دیو سنگھ	ڈاکٹر محمد نوشاد احمد
ڈاکٹر عبدالباسط حمیدی	ڈاکٹر محمد سہیل انور
ڈاکٹر محمد جلال الدین	ڈاکٹر بالمیکی رام

فہرست

اپنی بات	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	۵
بوستان اکبر		
اکبری تنقید اور تنقید اکبر	پروفیسر محمد حسن	۱۰
افکار اکبر الہ آبادی کی عصری معنویت	پروفیسر قدوس جاوید	۱۶
الہ آباد کی شعری روایت اور اکبر۔۔۔۔	پروفیسر علی احمد فاطمی	۲۷
اکبر الہ آبادی کی قرأت نو	پروفیسر ابوبکر عباد	۴۰
اکبر الہ آبادی کا تصور اخلاقیات	ڈاکٹر آفتاب احمد منیری	۴۹
حضرت شاہ اکبر داناپوری اور اکبر الہ آبادی	مولانا سید شاہ محمد ریان	۵۳
کلام اکبر الہ آبادی میں مزاحمتی رویہ	ڈاکٹر شیخ فاروق باشا	۶۳
اکبر الہ آبادی کی غزل گوئی	ڈاکٹر ظفر انصاری ظفر	۶۸
اکبر کی حمایت میں	ڈاکٹر محمد شارب	۷۴
اکبر کی طنزیہ شاعری میں مذہبی افکار	ڈاکٹر ارشاد سیانوی	۸۳
گلہائے نو:-		
اکبر الہ آبادی کی شاعری مغربی تہذیب۔۔۔	محمد رضا اظہری	۹۲
اکبر الہ آبادی کی شعری جہات	شمس الدین ملک	۹۷
اکبر الہ آبادی کی شاعری میں سیاسی وسماجی فکر	ڈاکٹر ضمیر رضا	۱۰۲
اکبر الہ آبادی کی شاعری کے مختلف عناصر	ڈاکٹر نعمت شمع	۱۰۵
اکبر الہ آبادی کی شاعری میں اخلاقی قدریں	شمع کوثر شمع	۱۱۱
شہنشاہ طنز وظرافت: اکبر الہ آبادی	ڈاکٹر فائزہ احمد	۱۱۷
اکبر الہ آبادی: قوم وملت کا مسیحا	ڈاکٹر ممتاز جہاں	۱۲۰
اکبر الہ آبادی کی عشقیہ شاعری	محمد علیم الدین شاہ	۱۲۴
گلشن ساحر		
امید ونشاط کا شاعر: ساحر لدھیانوی	پروفیسر علی احمد فاطمی	۱۲۸
ساحر لدھیانوی کی دو نظمیں: ایک جائزہ	پروفیسر اسلم جمشید پوری	۱۳۴
ساحر لدھیانوی کی فلمی اور غیر فلمی شاعری کا۔۔۔۔	ڈاکٹر عبدالحنان سبحانی	۱۳۸

URDU JOURNAL, A Research & Refereed Journal (ISSN-2249-7854) 2021, P:63-67
Dr Shaikh Faroque Basha, Kalam-e-Akbar Allahabadi Main Mozahamati Rawayya

ڈاکٹر شیخ فاروق باشا
لیکچرار، شعبہء اردو، گورنمنٹ ڈگری کالج، رائے چوٹی، آندھرا پردیش

کلام اکبر الہ آبادی میں مزاحمتی رویہ

لسان العصر اکبر الہ آبادی کی ولادت اس وقت ہوئی جب کہ سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ ٹمٹا رہا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ظالم شکنجہ تقریباً سارے ہندوستان کو جکڑ چکا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد ہندوستانیوں کی رہی سہی طاقت توڑ دی گئی۔ اس وقت اکبر الہ آبادی کی عمر صرف گیارہ سال تھی۔ انگریزوں کے ظلم واستبداد کا نقش ہمیشہ کے لیے ان کے دل ودماغ پر مرتسم ہوگیا۔ بغاوت کے بعد ہندوستانی خصوصاً مسلم قوم انگریزوں کے عتاب کا شکار رہی۔ خوف ودہشت، ذلت ورسوائی، فقر وفاقہ اور غلامی ومحکومی ان کا مقدر بن گئی۔ اسی زمانے میں محسن قوم وملت سرسید احمد خاں نے محسوس کیا کہ انگریزی حکومت سے مبارزت کے بجائے مصالحت کا رویہ اپنانا چاہیے، عداوت کے بجائے رفاقت کا راستہ اختیار کیا جائے، سرسید نے اپنی قوم کو مغربی علوم سے استفادہ کرنے کی تلقین کی۔ اس سلسلہ میں ان کے تعلیمی کارنامے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

ہندوستان پر انگریزی حکومت کا جب پوری طرح تسلط ہو چکا تو انہوں نے مسلم قوم پر طرح طرح کے مظالم شروع کر دیے۔ قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوگیا، سرکاری ملازمتوں سے انہیں کنارہ کش کیا گیا، جاگیریں، مناصب اور وظیفے ختم کر دیے گئے۔ بہت سے لوگوں کو کالے پانی کی سزا سنائی گئی۔ کل تک جو برسر اقتدار تھے آج وہ محکوم، مجبور اور مقہور ہو گئے۔ بقول میر تقی میرؔ

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تخت و تاج کا

مغربی نظام تعلیم کا رواج، مغربی تہذیب کا جنون، مغرب کی کورانہ تقلید، عریانیت اور فیشن پرستی، اختلاط مرد وزن، الحاد پرستی، مفاد پرستی، غلامانہ ذہنیت، عیسائیت کی تبلیغ جیسے امور ہندوستان میں پنپ رہے تھے جن کی روک تھام کے لیے اکبر الہ آبادی کو شدید مزاحمت کرنی پڑی۔ مزاحمت، مصالحت اور مفاہمت کی ضد ہے۔ چونکہ برسر اقتدار حکومت کے خلاف مزاحمت ہے اس لیے انہوں نے راست اور سنجیدہ تیرونشتر چھوڑنے کے بجائے طنز و مزاح کا اسلوب اختیار کیا۔ برسر اقتدار حکومت کے خلاف، آواز اٹھانا، ناخوشگوار اور ناسازگار حالات میں صدائے حق بلند کرنا، گویا اپنی موت کو آواز دینا تھا۔ لیکن اکبر الہ آبادی نے یہ کام بڑی خوبی اور ہمت سے کیا۔ کبھی اشارے

اور کنایے میں مزاحمت کی، کبھی دبے الفاظ اور دھیمے لہجہ میں، کبھی کھل کر بھی مزاحمتی رویہ اختیار کیا اور مختلف اشاروں ،علامتوں اور استعاروں میں اپنی مزاحمت پیش کی۔ چند علامتیں پیش ہیں۔

بت، انگریزوں کی علامت، پیر اور مرشد، سر سید احمد خاں کی علامت، اونٹ مسلمانوں کی، گائے ہندوؤں کی، برہمن ہندوؤں کی مذہبی جماعت کا نمائندہ، جہاز اور کشتی ملک کی، زاغ اور الو انگریزوں کے نقالوں کی، بدھو عام مسلمانوں کی علامت ہے۔ اکبر نے ان علامتوں کو بعض جگہ واضح بھی کیا ہے۔

بدھو سے صرف ہند کا مسلم مراد ہے　　مقصود عاجزی ہے غرور اک فساد ہے

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا　　بت کے بندے ملے، اللہ کا بندہ نہ ملا

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے　　کردیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا

رشید احمد صدیقی اکبرالہ آبادی کے مزاحمتی رویہ کے تعلق سے کہتے ہیں۔

"حوصلہ و ہوس کی، الفت و آویزش کی، پیش قدمی و پسپائی کی، شور و سکوت کی اور سود و زیاں کی اکبر کی شاعری میں جلوہ گری ہے۔ کہیں خفی، کہیں جلی، کہیں شگفتہ، کہیں حزیں لیکن ہر جگہ دلنشیں، اس عہد کے سیاسی شعور کو سمجھنے کے لیے اکبر کے کلام سے ہر طرح کی مدد لی جاسکتی ہے، شاید اتنی قیمتی مدد کہیں اور سے حاصل بھی نہیں ہوسکتی"۔

اکبرالہ آبادی نے سب سے زیادہ مغربی تہذیب سے مزاحمت کا رویہ اپنایا ہے۔ وہ مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے اور مشرقی تہذیب کی اساس اور بنیاد، مذہب، روحانیت اور اخلاق پر ہے۔ مغربی تہذیب کی بنیاد الحاد ،مادیت اور فحاشی پر ہے۔ اکبر اپنی قوم کو اس تہذیب کی پرچھائیوں سے بچانا چاہتے تھے۔ یہ امر مسلم ہے کہ محکوم قوم بہت جلد حاکم قوم کی کورانہ تقلید کرتی ہے۔

مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کے خلاف اردو زبان کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں نے مزاحمتی رویہ اپنایا ہے لیکن اس سلسلہ میں شاعر مشرق علامہ اقبال اور اکبرالہ آبادی سب سے بیش پیش نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال کی مزاحمت کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی

جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا نا پائیدار ہوگا

اکبرالہ آبادی نے بھی جابجا اپنے کلام میں طنز و مزاح کے پیرائے میں مغربی تہذیب پر وار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کرلی　　نئے صنم کی تمنا میں خودکشی کرلی

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی　　چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی

واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر   پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

اکبرالہ آبادی کو یہ خوف شدید تھا کہ مغربی تہذیب وتمدن مسلم قوم کو اخلاقی انحطاط کے سمندر میں ڈبو دے گی۔آخر ہوا بھی یہی۔

نئی تہذیب سے ساقی نے ایسی گرمجوشی کی   کہ آخر مسلموں میں روح پھونکی بادہ نوشی کی

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

تہذیب نو کے رنگ پر بلبل بنے ہیں سب   واللہ کیا بہار ہے اس سبز باغ میں
یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے   نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

اکبرالہ آبادی ایک مشرقی تہذیب کے پیروکار اور مذہب پسند شخص تھے،مغربی تہذیب کی اندھی تقلید سے انہیں مشرقی تہذیب کے اعلی اقدار خطرے میں دکھائی دے رہے تھے، بے حیائی اور فیشن پرستی کی وبا عام ہو رہی تھی۔حقوق نسواں اور مساوات مرد وزن کی آڑ میں مغربی دنیا نے خواتین کو سڑکوں پر مردوں کے برابر لا کھڑا کر دیا تھا۔اکبر نے خواتین کو عریانی اور فحاشی سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ایک رباعی میں خواتین کی بے حیائی اور بے حجابی کے تعلق سے کہتے ہیں۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں   اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا   کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑگیا

برطانوی حکومت نے حصول اقتدار کے بعد اس بات کی کوشش کی کہ مشرقی طرز تعلیم کا سد باب کیا جائے تاکہ ان میں مذہب سے بیزاری ،قدامت پسندی اور اعلی اقدار کا فقدان ہو چنانچہ انہوں نے مغربی طرز تعلیم ہندوستان بھر میں رائج کرنا شروع کر دیا۔جدید فلسفہ اور سائنسی علوم کو عام کر دیا تاکہ مذہبی عقائد اور روایات کی قدر و منزلت کم ہو۔مسلمانوں میں مغربی تہذیب کے پیروکار اور تقلید کرنے والے پیدا ہوں ۔برطانوی حکومت کے لیے کم تنخواہ پر کام کرنے والے ملازمین ہندوستان ہی میں مل جائیں ،انگلستان سے نہ منگوانا پڑے اور یہ فکر دی گئی کہ برطانوی تہذیب اور معاشرت خوشحالی اور ترقی کی علامت ہے اور مشرقی تہذیب تنزلی وانحطاط کی علامت، ان مقاصد کے حصول کے لیے نئے تعلیمی نصاب اور نئی تعلیمی پالیسوں کو نافذ کیا گیا۔ایسے میں اکبرالہ آبادی کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ نئی تعلیمی پالیسی سے تہذیب وتمدن ،دینی وملی غیرت ،ہمدردی اور رحم دلی ختم ہو جائے گی۔محض دولت حاصل کرنا ،ڈگری پانا ،نوکری کرنا اور پنشن لینا ہو جائے گا۔ان خیالات کا کھل کر اپنی شاعری میں اظہار خیال کیا ہے۔کہتے ہیں:

میں کیا کہوں احباب کیا کار نمایاں کر گئے   بی اے کیا ،نوکر ہوئے ،پنشن ملی اور مر گئے

ایک اور شعر یوں ہے۔

پڑھ کر انگریزی میں دانا ہوگیا
"کم" کا مطلب ہی کمانا ہوگیا

اکبرالہ آبادی کے خیال میں تعلیم وہ واحد ذریعہ ہے جس سے قوموں کے قلوب واذہان کو غلام بنایا جاسکتا ہے، یہ ایسا مؤثر ہتھیار ہے جو قتل وخون سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اپنے ایک مشہور شعر میں اس خیال کو اس طرح پیش کرتے ہیں۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

قوم کے تعلیمی رہنما اور سماجی مصلح سرسید احمد خاں کے تعلیمی افکار سے اکبرالہ آبادی مطمئن نہیں تھے کیونکہ ان کے خیال میں علی گڑھ کا تعلیمی مرکز ظاہری چمک دمک اور دنیاوی ترقی کی حد تک محدود ہوگیا تھا۔ یہاں کے تعلیم یافتہ مادیت اور عقلیت کو سب کچھ سمجھ رہے تھے۔ وہ سرسید اور علی گڑھ کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہتے ہیں۔

ابتدا کی جناب سید نے جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پر ہوئی قوم کا کام اب تمام ہوا

اس فکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
مل کا آٹا ہے نل کا پانی ہے
آب و دانہ کی حکمرانی ہے

مغربی علوم وفنون، کے خلاف مزاحمتی رویہ کو دیکھ کر کوئی یہ خیال نہ کرے کہ اکبر جدید تعلیم اور علوم وفنون ،صنعت وحرفت کے مخالف ہیں۔ انہوں نے صرف تعلیم کے نام پر مردوزن کے اختلاط، بے پردگی، مغربی فیشن پرستی اور ناچ گانے پر چوٹ کی ہے۔ ہر حال میں دینی مزاج اور مذہب کو قابل نمونہ سمجھنے کی تلقین کی ہے۔ ان کے چند اشعار اس بات کی غمازی کرتے ہیں۔

وہ باتیں جن سے قومیں ہورہی ہیں نامور سیکھو
اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو
بڑھاؤ تجربے ،اطراف دنیا میں سفر سیکھو
خواص خشک و تر سیکھو علوم بحر و بر سیکھو

دینی غیرت اور حمیت کو ابھارتے ہوئے کہتے ہیں۔

خدا کے واسطے اے نوجوانو ،ہوش میں آؤ
دلوں میں اپنی غیرت کو جگہ دو ،جوش میں آؤ

ایک اور جگہ اسی خیال کو پیش کرتے ہوئے مذہب اور دین کو سرچشمہ ہدایت سمجھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

تم شوق سے کالج میں پھلو، پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو ،چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندہء عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اکبرالہ آبادی اس خیال کی پرزور مخالفت کرتے ہیں کہ انگریز جہاں جائیں گے وہاں سائنسی ایجادات اور ٹکنالوجی ترقی کرے گی۔ ایجادات ان ملکوں میں بھی ہیں جہاں انگریز حکمران نہیں ہیں۔ جدید ایجادات کی

مخالفت انہوں نے کبھی نہیں کی بلکہ اس کے سیکھنے پر ابھارا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

عزم کر تقلید مغرب کا ہنر کے زور سے   لطف کیا جو لد لیے موٹر پر زر کے زور سے

ان کے علاوہ الحاد پرستی کے خلاف بھی ان کی مزاحمت قابل قدر ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

صدائے الحاد اٹھ رہی ہے خدا کی اب یاد اٹھ رہی ہے   دلوں سے فریاد اٹھ رہی ہے کہ دین سے ہم گزر رہے ہیں

غرض اکبرالہ آبادی نے اپنے قلم وقرطاس کے ذریعہ ہر اس ناخوشگوار اور نامناسب رویے کے خلاف مزاحمت کی جو ہمارے ملک میں پنپ رہے تھے، سماجی برائیوں، معاشرتی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی، حالانکہ وہ حکومت کے اعلی عہدوں پر قائم رہے اس کے باوجود حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔ اور یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ اردو کے مزاحمتی ادب میں اکبرالہ آبادی کا احتجاجی اور مزاحمتی رویہ بہت توانا دکھائی دیتا ہے۔

❁❁❁

بہار کی بہار (جلداول ودوم)

مصنف۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد

بہار کی ادبی وتہذیبی تاریخ کا دستاویزی سلسلہ

ملنے کا پتہ

بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴